ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

اپریل ——— جون ۲۰۰۰ء

—: ایڈیٹر :—

سید جلال الدین عمری

پان والی کوٹھی دودھپور علی گڑھ
۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۹ — شمارہ ۲

اپریل ——— جون ۲۰۰۰ء

ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ ——— ربیع الاول ۱۴۲۱ھ

زرتعاون

اندرون ملک		فی شمارہ		۲۰ روپیے
		سالانہ		۷۵ روپیے
	لائبریری واداروں	سالانہ		۱۰۰ روپیے
بیرون ملک	(انفرادی)		"	۲۵۰ روپیے
	(ادارے)		"	۵۰۰ روپیے
پاکستان	(انفرادی)		"	۱۵۰ روپیے
	(ادارے)		"	۲۰۰ روپیے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے ناز پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

رسول اللہؐ کے مکی دور کے بعض اہم واقعات (۲) — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق و تنقید

نقدِ حدیث: ضرورت و ماہیت — ڈاکٹر خالد ظفر اللہ داؤدی — ۲۴

بحث و نظر

رسولِ کریمؐ کی ازدواجی زندگی
اعتراضات کا جائزہ — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۴۷

سیر و سوانح

شیخ حسن البناؒ اسلامی بیداری کے سرخیل — پروفیسر مسعود الرحمن خاں ندوی — ۷۶

تعارف و تبصرہ

شیئر بازار میں سرمایہ کاری — ڈاکٹر ولید احمد انصاری — ۱۱۱
خدمتِ خلق یا حقوق العباد — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳

خبرنامہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی — ۱۱۵

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر خالد ظفر اللہ داؤدی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، سمندری، فیصل آباد
پاکستان

۲۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

پروفیسر و سابق صدر شعبہ دراسات ایشیائے غربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر ولید احمد انصاری

ریڈر ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵۔ سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

خوش نویس

ابن سیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے بعض اہم واقعات

(۲)

سید جلال الدین عمری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ میں جن زہرہ گداز حالات سے گزرنا پڑا اور ان پر اذیتوں کے جو پہاڑ توڑے گئے اور جس طرح کا جور وستم ان کے ساتھ روا رکھا گیا اسے تاریخ نے اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے۔ یہاں اس کے بعض اوراق پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس حقیقت کو سمجھنے اور اور سمجھانے میں کتنا وقت اور کتنی قوت صرف ہوئی کہ اسلام دینِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، وہ ساری دنیا کے لیے بارانِ رحمت ہے اور اپنے دامن میں ہر فرد اور ہر قوم کی فلاح وکامرانی کا سامان لے کر آیا ہے۔ اس سے عداوت اپنی ذات سے عداوت، اپنے خاندان، قبیلے اور اپنی قوم سے بلکہ نوعِ انسانی سے عداوت ہے۔ جو ان سب کا دشمن ہے وہی اسلام سے دشمنی کر سکتا ہے۔

پہلے ان زیادتیوں اور جفاکاریوں کا حال دیکھئے جو دنیا کے سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ روا رکھی گئیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں قریش کے کچھ لوگ بھی تھے۔ قریب ہی میں دو ایک روز قبل اونٹ ذبح ہوئے تھے۔ ابوجہل نے کہا کیا کوئی شخص اس میں سے ایک اوجھڑی لا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پشت پر ڈال سکتا ہے؟ اس پر بدنصیب عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اوجھڑی لے آیا۔ جب آپ سجدے میں گئے، شانہ ہائے مبارک کے درمیان ڈال

دی۔ اس پر سب لوگ ہنسنے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ آپ نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں اس موقف میں نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر اس گندگی کو ہٹاتا ورنہ ضرور ہٹا دیتا۔ اسی اثناء میں حضرت فاطمہؓ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ وہ اس وقت کمسن تھیں۔ دوڑی ہوئی آئیں، گندگی کو دور کیا، جن افراد نے یہ حرکت کی انھیں بد دعا دینے لگیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے دعا کی: اے اللہ! ان سرداران قریش ـــ ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، عقبہ بن ابی معیط ـــ کو تو اپنی گرفت میں لے لے اور ان پر عذاب نازل فرما۔ میں نے اس سے پہلے آپؐ کو کسی کے حق میں بد دعا کرتے نہیں سنا تھا۔ جب سرداران قریش نے آپؐ کے الفاظ سنے تو یکلخت گھبرا اٹھے کہ آپؐ کی دعا ضرور قبول ہوگی اور ان پر اللہ کا عذاب آئے گا چنانچہ میں نے دیکھا کہ بدر میں یہ سب کے سب مارے گئے اور ایک گڑھے میں پھینک دیئے گئے۔[1]

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کی جانب سے جو سخت تکلیف پہنچی وہ کیا تھی؟ انھوں نے (اپنے علم کی حد تک) جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا اور گردن مبارک میں چادر کو بل دے کر اس زور سے کھینچا کہ آپؐ کا دم گھٹنے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ دوڑے ہوئے پہنچے۔ عقبہ کا شانہ پکڑ کر اسے دور ہٹایا اور کہا کہ کیا تم ایک ایسے شخص کو مار ڈالنا چاہتے ہو جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ اللہ ہی اس کا رب ہے۔[2]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آپؐ کو جو سخت ترین اذیت پہنچی وہ یہ تھی کہ ایک روز آپ گھر سے نکلے۔ راستے میں جس کسی سے بھی ملاقات ہوئی خواہ وہ آزاد ہو یا

---

[1] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔ مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب مالقی النبیؐ من اذی المشرکین والمنافقین۔

[2] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مالقی النبی واصحابہ الی آخرہ۔ مسند احمد: ۲/۲۱۶۔ اس واقعہ کی تفصیل ابن ہشام نے کچھ دوسرے انداز میں پیش کی ہے۔ السیرۃ النبویہ، داراحیاء التراث العربی، لبنان ۱۹۹۴: ۱/۳۲۶۔

غلام ہر ایک نے آپؐ کی تکذیب کی اور آپؐ کو اذیت پہنچائی۔ آپؐ جب گھر لوٹے تو شدتِ غم سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی موقع پر آیات یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ..... نازل ہوئیں[1]

ایک مرتبہ قریش کے سفہا میں سے ایک سفیہ نے سر مبارک پر خاک ڈال دی۔ آپ گھر پہنچے تو مٹی موجود تھی۔ آپؐ کی صاحبزادی نے مٹی صاف کی اور رونے لگیں آپؐ نے فرمایا، بیٹی! مت رو اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا[2]

ان ظالموں کی وجہ سے آپ گھر کے اندر نماز پڑھنے لگے لیکن وہاں بھی سکون سے رہنے نہیں دیتے تھے حتیٰ کہ کبھی کبھی کھانے کی ہانڈی میں گندگی ڈال دی جاتی، جب اس طرح کی حرکت ہوتی تو آپؐ لکڑی سے اسے اٹھاکر باہر لے جاتے اور دروازے پر کھڑے ہوکر فرماتے اے بنو عبد مناف! یہ کس قسم کی ہمسائیگی ہے۔ پھر اسے دور پھینک آتے[3]

حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ احد کے دن سے بھی زیادہ سخت اور کوئی دن آپ پر گزرا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تمہاری قوم سے جو تکلیف مجھے پہونچی وہ پہونچی لیکن سب سے زیادہ سخت وہ دن تھا جب کہ میں نے طائف کے سرداروں کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی لیکن انھوں نے بری طرح رد کر دیا۔ مجھے اپنے ہاں سے نکال دیا۔ میں شدتِ غم سے نڈھال چلا جا رہا تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں قرن ثعلب میں تھا[4] واپسی میں غنڈوں کو پیچھے لگا دیا۔ انھوں نے آپ پر پتھر پھینکنے شروع کر دئے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۳۲۸

[2] طبری، تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان۔ ۱۹۹۷ء: ۱/۵۵۳ - ۵۵۴

ابن کثیر۔ السیرۃ النبویہ؛ دار المعرفۃ، بیروت، لبنان ۱۹۸۳ء : ۲/۱۲۶

[3] طبری تاریخ الامم والملوک ۱/۵۵۳، ابن کثیر، السیرۃ النبویہ : ۲/۱۲۸

[4] بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین والملائکۃ فی السماء الخ۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب مالقی النبیؐ من اذی المشرکین والمنافقین۔

حضرت زید بن حارثہؓ بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن قدم مبارک لہولہان ہوگئے اور سر پر بھی چوٹ آئی۔[۱]

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَقَدْ اُخِفْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُخَافُ اَحَدٌ وَلَقَدْ اُوْذِیْتُ فِی اللّٰہِ وَمَا یُؤْذٰی اَحَدٌ وَلَقَدْ اَتَتْ عَلَیَّ ثَلَاثُوْنَ مِنْ یَوْمٍ وَ لَیْلَۃٍ وَمَا لِیْ وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ یَاکُلُہٗ ذُوْکَبِدٍ اِلَّا شَیْءٌ یُوَارِیْہِ اِبْطُ بِلَالٍ [۲]	مجھے اللہ کی راہ میں جتنا ہراساں کیا گیا اتنا کسی کو نہیں کیا گیا، مجھے اللہ کی راہ میں جتنی اذیتیں پہونچیں اتنی کسی کو نہیں پہونچیں۔ مجھ پر تیس ایسے روز و شب گزرے ہیں کہ میرے اور بلالؓ کے لیے کوئی چیز جسے کوئی جاندار (پیٹ بھر کر) کھا سکے، نہیں تھی۔ بس اتنی ہوتی تھی جسے بلال اپنے بغل میں رکھ لیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جسمانی تکلیفیں پہنچیں بعض صحابہ کرامؓ کو ان سے زیادہ تکلیفیں پہنچیں۔ ان تکالیف سے آپؐ کو ذہنی اور روحانی صدمہ پہنچتا تھا اس لیے کہ یہ تکلیفیں آپؐ پر ایمان ہی کے نتیجے میں صحابہ کو پہنچ رہی تھیں۔ اس پہلو سے آپ نے سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کیں۔ انبیاء علیہم السلام میں حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ شہید کر دیے گئے لیکن یہاں قتل کا ذکر نہیں ہے۔ زندہ رہتے ہوئے جو تکلیف دی گئی اس کا بیان ہے۔[۳]

حضرت ابوبکرؓ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق خاص تھے، ان کو بھی طرح طرح سے اذیتیں پہنچائی جاتیں۔ حضرت عائشہؓ اس سلسلہ کا ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ کی تعداد اڑتیس (۳۸) ہوگئی تو حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] ابن سعد، طبقات: ۱/۲۱۱-۲۱۲۔ دار صادر بیروت ۱۹۸۵ء

[۲] ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ۔ مسند احمد: ۴/۲۰۴۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء
مسند احمد کی ایک روایت میں تیس دن کی جگہ تین دن کا ذکر ہے۔ ولقد اتت علیّ ثلاثہ من بین یوم و لیلۃ۔ ۳/۵۶۹۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن ماجہ، مقدمہ، فضل سلمان و ابی ذر و المقداد حدیث نمبر ۱۵۱

[۳] ابن حجر فتح الباری: ۷/۵۵۵-۵۵۶۔ دار الفکر، بیروت، لبنان ۱۹۹۶ء

سے عرض کیا کہ اب ہمیں اپنے اسلام کا کھل کر اظہار کرنا چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ ابھی ہم تھوڑے ہیں لیکن حضرت ابوبکرؓ اصرار کرتے رہے۔ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے اظہار و اعلان کا فیصلہ فرمایا۔ مسلمان خانہ کعبہ کے مختلف گوشوں میں اپنے اپنے قبیلہ میں پہنچ گئے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر خطبہ دیا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ پہلے خطیب تھے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف علی الاعلان دعوت دی۔ اس پر مشرکین حضرت ابوبکرؓ اور ان مسلمانوں پر جو اپنے اپنے قبیلے میں تھے، ٹوٹ پڑے اور بری طرح زدوکوب کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کو سختی سے روند ڈالا۔ ان کے کافی چوٹیں آئیں۔ عتبہ بن ربیعہ ابوبکرؓ کو چمڑے کے جوتوں سے مارنے لگا۔ اس سے آپؓ کا چہرہ اس قدر سوج گیا کہ چہرے اور ناک میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ آپ کے خاندان بنوتیم کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے، مشرکین کو دفع کیا اور ابوبکرؓ کو چادر میں ڈال کر ان کے گھر اٹھا لے گئے۔ ان لوگوں کو یقین سا ہوگیا تھا کہ آپ زندہ نہیں بچیں گے چنانچہ ان لوگوں نے حرم پہنچ کر اعلان کیا کہ اگر ابوبکرؓ کا انتقال ہوگیا تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو قتل کردیں گے۔ یہ لوگ واپس گھر پہنچے، ابوبکر کے والد ابوقحافہؓ اور خاندان کے دوسرے افراد نے حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بول نہیں پا رہے تھے۔ دن کے آخر میں آپ بولے تو پہلا سوال یہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ اس پر خاندان کے لوگ انھیں ملامت کرنے لگے اور آپ کی والدہ ام الخیر سے کہا کہ جاؤ انھیں کچھ کھلاؤ پلاؤ جب وہ آپ کے قریب پہنچ کر اصرار کرنے لگیں تو اس وقت بھی وہ یہی دریافت کرتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ مجھے تمہارے دوست کا حال معلوم نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ام جمیل بنت خطاب کے پاس جاؤ اور ان سے حال معلوم کرآؤ۔ وہ ام جمیل کے پاس پہنچیں اور کہا کہ ابوبکر، محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال تم سے دریافت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا میں ابوبکر اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں جانتی، اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے بیٹے کے پاس چل سکتی ہوں۔ انھوں نے کہا اچھا چلو، گھر پہنچ کر ام جمیل نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ بے جان سے پڑے ہیں تو وہ چیخ پڑیں کہ جن کفار نے آپ کے ساتھ یہ

حرکت کی ہے، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان سے انتقام لے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھا۔ انھوں نے اشارہ کیا آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ان سے کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے، تو انھوں نے بتایا کہ آپؐ صحیح سالم اور محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو انھوں نے بتایا کہ دارِ ارقم میں ہیں، ابوبکرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم جب تک آپؐ کے پاس میں نہ پہنچ جاؤں کچھ کھاؤں گا پیوں گا نہیں۔ رات میں جب لوگ آرام کرنے لگے۔ تو یہ دونوں آپ کو لے کر نکلیں۔ آپ اپنی ماں کے سہارے چل رہے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت ابوبکر کو پہنچایا گیا تو آپؐ نے جھک کر حضرت ابوبکرؓ کو بوسہ دیا اور مسلمان بھی آپ پر محبت سے جھک پڑے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس حال میں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا اثر ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں ٹھیک ہوں۔ البتہ اس فاسق کے میرے چہرے پر مارنے سے جو چوٹ آئی ہے اس میں تکلیف ہے۔ یہ میری ماں اپنے لڑکے کے ساتھ آئی ہے۔ آپ کی ذات بابرکت ہے۔ آپ انھیں اللہ کی طرف دعوت دیں۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ آپ کے ذریعہ انھیں جہنم سے نجات دے۔ آپؐ نے دعا کی اور وہ ایمان لے آئیں[1]

حضرت عثمان بن مظعونؓ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھے۔ بالکل ابتدائی دور میں اسلام لے آئے تھے۔ ان کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دے رکھی تھی، بعد میں انھوں نے اس کی پناہ رد کر دی، اسی کے بعد کا واقعہ ہے کہ مشہور شاعر لبید بن ربیعہ[2] نے قریش کی ایک مجلس میں اپنا ایک شعر پڑھا۔ پہلا مصرعہ تھا

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ — سن لو اللہ کے سوا ہر چیز مٹنے والی ہے

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ: ۴۳۹/۱ - ۴۴۱۔ برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۴۷۵/۱-۴۷۶ دار المعرفۃ، لبنان۔

[2] لبید بعد میں مسلمان ہوگئے اور بڑی لمبی عمر پائی۔ ابن اثیر۔ اُسد الغابہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان۔ ۴/۴۸۲ - ۴۸۵

حضرت عثمانؓ نے کہا تم نے سچ کہا۔ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے
لبید نے دوسرا مصرعہ پڑھا :۔

وکلّ نعیمٍ لامحالۃ زائل — ہر نعمت بہرحال ختم ہونے والی ہے

حضرت عثمانؓ نے کہا کہ یہ تم نے غلط کہا ہے، جنت کی نعمتیں لازوال ہیں۔ لبید بن ربیعہ نے کہا اے قریش کے لوگو! قسم خدا کی تمہاری مجلس میں جو بیٹھتا اسے کوئی اذیت نہیں پہنچتی تھی۔ اب یہ کب سے ہونے لگا ہے۔ اس پر ایک شخص نے کہا ہمارے ہاں کچھ بیوقوف ہیں جنھوں نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے۔ یہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ تم اس کی بات کا برا نہ مانو۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کچھ جواب دیا تو بات بڑھ گئی۔ اس شخص نے اٹھ کر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ بیکار ہوگئی۔ مجلس میں ولید بن مغیرہ بھی تھا۔ اس نے کہا بھتیجے اگر تم میری مضبوط پناہ میں ہوتے تو آج یہ آنکھ ضائع نہ ہوتی۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ نے کہا قسم خدا کی، میں چاہتا ہوں کہ میری دوسری آنکھ جو صحیح ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں ختم ہو جائے۔ اے عبد شمس! میں اس ہستی کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے۔ ولید نے کہا کہ اب بھی موقع ہے تم دوبارہ میری پناہ میں آجاؤ۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے[۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود مکہ کے ابتدائی دور کا حال بیان کرتے ہیں کہ ایک روز صحابہ کے درمیان بات ہونے لگی کہ قریش کے لوگوں نے ابھی تک قرآن مجید کو زور سے تلاوت کرتے نہیں سنا ہے۔ کون ہے جو انھیں جہر کے ساتھ قرآن سنائے؟ میں نے کہا میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔ صحابہ نے کہا تمہارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا، وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کر سکتے ہیں۔ ہم تو کوئی ایسا آدمی چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہے تو اس کا قبیلہ اسے روک دے۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ کام کرنے دو۔ اللہ میری حفاظت کرے گا۔ چنانچہ صبح جب دھوپ ذرا تیز ہوئی اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے تو عبداللہ بن مسعودؓ مقام ابراہیم کے پاس پہنچے اور پورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۴۰۸۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۳/۵۹۰

کردی۔ مشرکین نے جب آواز سنی تو کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے کہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعودؓ) یہ کیا کہہ رہا ہے؟ ۔ پھر کہا اچھا یہ وہی کلام ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کر رہے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے منھ پر طمانچے مارنے لگے لیکن عبداللہ بن مسعود نے اس کے باوجود قرآن جتنا سنا سکتے تھے سنایا۔ جب صحابہ کرام کے پاس پہنچے تو چہرہ پر چوٹ کے نشانات تھے۔ صحابہ نے کہا اسی اندیشہ کی وجہ سے ہم تمہیں منع کر رہے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ یہ دشمنانِ خدا پہلے سے زیادہ مجھے بے وزن محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو کل پھر میں انھیں قرآن مجید سناؤں۔ لوگوں نے کہا اب اس کی ضرورت نہیں ہے جس کلام کو وہ ناپسند کرتے ہیں اسے تم نے بہرحال سنا دیا یہ کافی ہے[1]

حضرت عمرؓ ہجرتِ مدینہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اور عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن العاص نے طے کیا کہ سویرے ایک متعین جگہ (قبیلۂ بنی غفار کے چشمہ کے پاس) ہم جمع ہوں گے اور اگر کوئی نہ پہنچے تو یہ سمجھا جائے گا کہ مشرکین نے اسے قید کر لیا ہے۔ باقی دو اصحاب سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔ میں اور عیاش بن ابی ربیعہؓ تو متعین جگہ پر پہنچ گئے اور مدینہ ہجرت کی لیکن ہشام بن العاص کو کفار نے گرفتار کر لیا اور وہ سخت آزمائش سے گزرے[2]

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہشام بن العاص کو تو کفار نے ہجرت کرنے نہیں دیا لیکن میں اور عیاش بن ربیعہ جب مدینہ پہنچ گئے تو ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام (یہ دونوں عیاش بن ربیعہ کے اخیافی بھائی تھے) مدینہ ان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ ماں نے نذر مان رکھی ہے کہ جب تک تمہیں نہ دیکھ لے سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور دھوپ سے سائے میں نہیں جائے گی۔ یہ سن کر ان کے جذبات ابھر آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ عیاش! قسم خدا کی یہ دونوں تمہیں اپنے دین

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/۱۵۱-۳۵۲ - اسد الغابہ: ۳/۳۸۴

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۲/۲۸ - ابن سعد الطبقات الکبریٰ: ۴/۱۹۱ - ابن اثیر اسد الغابہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان: ۵/۳۷۶ - ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ۶/۲۲۳ - دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۵ء
۱۳۲

سے پھیرنے کی تدبیر کر رہے ہیں ان سے ہوشیار رہو۔ اگر تمہاری ماں کو جوئیں پریشان کریں گی تو کنگھی کرے گی اور مکہ کی گرمی سخت ہوگی تو سائے میں بھی جائے گی۔ عیاش نے کہا، میں اپنی ماں کی قسم پوری کرکے واپس لوٹ آؤں گا۔ میرا مال بھی وہاں رہ گیا ہے وہ بھی لے لوں گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ میں (اس وقت) قریش کا سب سے زیادہ مالدار آدمی ہوں۔ میرا آدھا مال لے لو لیکن ان کے ساتھ مت جاؤ۔ انھوں نے میری بات نہیں مانی اور سفر کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے کہا جب تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری یہ اونٹنی لے جاؤ۔ یہ بہت عمدہ اونٹنی ہے۔ اس سے نیچے مت اترو۔ اگر تمہیں ان سے کچھ کھٹک محسوس ہو تو اسی اونٹنی پر تیزی سے نکل آؤ اور ان لوگوں سے نجات حاصل کرلو۔ چنانچہ وہ اسی اونٹنی سے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ابوجہل نے کہا کہ یہ میرا اونٹ ٹھیک سے چل نہیں رہا ہے کیا تم اپنی اونٹنی پر مجھے بٹھا سکتے ہو۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ جب وہ اونٹنی کو بٹھا کر نیچے اترے تو یہ دونوں بھی اپنی سواریوں سے اترے اور فوراً ان کو پکڑ کر رسی سے باندھ لیا اور مکہ لے گئے۔ مکہ پہنچ کر اعلان کیا۔ اے اہل مکہ دیکھو اپنے بے وقوفوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کرو جیسا ہم نے اپنے اس بے وقوف کے ساتھ کیا ہے۔[۱]

جو صحابۂ کرام سن رسیدہ اور بااثر تھے اور جن کے پیچھے ان کے قبائل کی طاقت تھی، ان کے ساتھ بھی موقع ملنے پر دوسرے قبائل ظلم وزیادتی کرگزرتے تھے، لیکن جو صحابہ کم سن تھے ان پر خود ان کے قبیلے جور وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کا شمار 'السابقون الاولون' میں ہوتا ہے۔ یہ مکہ کے بہت ہی خوبصورت اور دل موہ لینے والے نوجوان تھے۔ ان کے ماں باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی ماں دولت مند تھی، انھیں بہترین لباس پہناتی تھی۔ وہ مکہ میں سب سے زیادہ عطر اور خوشبو استعمال کرنے والے فرد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے مکہ میں ان سے زیادہ خوبصورت بالوں والا اور نازونعمت میں پلا ہوا کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ اس وقت اسلام لائے جب

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۸۸-۸۹۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲

کہ دارارقم مرکزِ تبلیغ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھل کر تبلیغ نہیں شروع کی تھی. یہ اپنی ماں اور اپنی قوم کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کر رہے تھے. دوسروں کی نگاہوں سے بچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دین سیکھتے. ایک دن ایک شخص نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ان کی ماں اور گھر کے دوسرے لوگوں کو اس کی اطلاع دی۔ اس پر انھیں پکڑ کر قید کر دیا گیا۔ بہت دنوں کے بعد وہ حبشہ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوئے تو ہیئت بالکل بدل چکی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ ہمیں تنگدستی اور معاشی تکلیف پہنچتی ہی تھی جب اسلام کی راہ میں تکلیف پہنچی تو یہ ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہم نے اس پر صبر کیا لیکن مصعب بن عمیرؓ مکہ کے بہت ہی ناز و نعمت میں پلے ہوئے جوان تھے ان کا لباس بہت ہی عمدہ اور نفیس ہوتا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اسلام لانے کے بعد انھیں سخت تکلیف پہنچی۔ ان کی کھال پر سانپ کی کھال کی طرح جھریاں پڑ گئی تھیں[1]

سلمہ بن ہشامؓ ابوجہل کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ مشرکین کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کی۔ حبشہ سے واپس ہوکر مدینہ ہجرت کرنی چاہی تو انھیں روک دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور دوسرے مستضعفین کے لیے جو مشرکین کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے، دعا قنوت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ آپ کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں۔

اللھم انج عیاش بن ربیعۃ، اللھم انج سلمۃ بن ھشام اللھم انج الولید بن الولید، اللھم انج المستضعفین من المومنین[2]	اے اللہ (مشرکین سے) نجات دے عیاش بن ربیعہ کو، اے اللہ! نجات دے سلمہ بن ہشام کو، اے اللہ نجات دے ولید بن ولید کو، اے اللہ نجات دے ان اہل ایمان کو جو مستضعفین ہیں (اور مکہ سے نکل نہیں پا رہے ہیں)

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۱۱۶-۱۱۷۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۵/۱۷۶

[2] بخاری، کتاب الاستسقاء، باب دعاء النبی اجعلھا سنین کسنی یوسف۔ مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ۔

ان تینوں کا تعلق بنو مخزوم سے تھا۔ بعد میں یہ حضرات کسی طرح مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔[۱]

حضرت زبیر بن عوامؓ نے بارہ اور ایک روایت کے مطابق سولہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔[۲] ان کا چچا انھیں ایک چٹائی میں باندھ کر دھواں دیتا تاکہ وہ کفر کی طرف پلٹ جائیں لیکن وہ یہی کہتے کہ میں کبھی کفر کی طرف واپس نہیں جا سکتا۔[۳]

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اور حضرت ابو بکرؓ کو نوفل بن خویلد نے ایک رسی میں باندھ دیا تھا۔ وہ قریش کا شیر خیال کیا جاتا تھا چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے قبیلہ (بنو تیم) کے لوگ کچھ نہ کر سکے۔[۴]

یہ ان لوگوں کا حال تھا جن کے خاندان اور قبیلے مکہ میں موجود تھے اور جو ان پر اس جور ناروا کو روک سکتے تھے۔ اس کے باوجود بعض اوقات وہ اسے روک نہیں پاتے یا اس میں ناکام رہتے۔

مکہ کے جو کم زور افراد اللہ کے دین کو قبول کرتے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیتے ان کی حالت اور ابتر تھی۔ ان کے ساتھ بڑا وحشیانہ اور غیر مہذب سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ مستضعفین اور کم زور انسان کون تھے؟ ان کے بارے میں ابن سعد میں ہے۔

والمستضعفین قوم لا عشائر لھم بمکۃ ولیست لھم منعۃ[۵]	مستضعفین وہ لوگ تھے، مکہ میں جن کے قبائل نہ تھے اور جن کو تحفظ اور قوت حاصل نہ تھی۔

ان میں زیادہ تر غلاموں کا طبقہ تھا۔ انھوں نے جب اسلام کا اعلان و اظہار کیا

---

[۱] ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ۲/۱۳۰-۱۳۱۔ ابن اثیر اسد الغابہ: ۲/۵۲۱-۵۲۲۔ ابن عبد البر، الاستیعاب ۲/۲۰۳

[۲] ابن عبد البر نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اور اقوال بھی ہیں۔ الاستیعاب فی اسماء الاصحاب، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء: ۲/۹۰

[۳] ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ۲/۵۷۴۔ زرقانی علی المواہب، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان ۱۹۹۶ء: ۱/۵۷۴

[۴] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۱۵ [۵] ایضاً ۳/۲۲۸

تو ان کے ساتھ جس بہیمیت اور درندگی کا مظاہرہ کیا گیا اس کا حال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

أوّل من أظهر الإسلام	سب سے پہلے سات افراد نے
سبعة رسول الله صلى الله عليه	اسلام کا اظہار و اعلان کیا وہ تھے
وسلم و أبوبكر و عمّار و	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ،
أمّه سميّة وصهيب و	عمّار، ان کی ماں سمیہ، صہیب، بلال
بلال والمقداد، فأمّا رسول	اور مقداد (رضی اللہ عنہم) جہاں تک
الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے،
فمنعه الله بعمّه أبي طالب	اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابو طالب
و أمّا أبوبكر فمنعه الله بقومه	کے ذریعہ آپ کی حفاظت فرمائی۔
و أمّا سائرهم فأخذهم	ابوبکرؓ کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم
المشركون فألبسوهم أدراع	کے ذریعہ لوگوں کی چیرہ دستی سے
الحديد و صهروهم في	بچایا۔ باقی اور پانچ کو مشرکین نے
الشمس[1]	پکڑا، انھیں لوہے کی زرہیں پہنائیں
	اور دھوپ میں پگھلنے کے لیے ڈال دیا۔

حالات اتنے شدید اور ناقابلِ برداشت ہوتے چلے گئے کہ ان سے بچنے کے لیے زبان سے کلمۂ کفر نکالنے اور شرک کی بظاہر تائید کرنے کی بھی اجازت دی گئی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قلب ایمان پر مطمئن رہے اور کفر کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہو۔ اس لیے کہ راہِ حق میں پیش آنے والی تکلیفوں اور آزمائشوں سے ہراساں ہو کر کفر کو اختیار کر لینا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ	جو اللہ کا انکار کرے اس پر ایمان
إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ	لانے کے بعد، سوائے اس کے
مُطْمَئِنٌّۢ بِالْإِيْمَانِ وَلٰكِنْ	جسے مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان

---

[1] مسند احمد: ۱/۴۰۴۔ ابن ماجۃ، مقدمہ، باب فضل سلمان وابی ذر والمقداد۔ طبقات ابن سعد: ۳/۲۳۲ میں حضرت مقداد کی جگہ حضرت خبیب کا ذکر ہے۔
١٣٦

مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا	سے مطمئن ہو (وہ معذور ہے) لیکن جو
فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ	کوئی شرحِ صدر کے ساتھ کفر کرے تو ایسے
وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ	لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے
بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ	لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انھوں
الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ	نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی
اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝	کو ترجیح دی۔ بے شک اللہ کافروں کو
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ	راہِ راست نہیں دکھاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں
قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ	کہ جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ لَا جَرَمَ	نے مہر لگادی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو
أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝	غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے شک
(النحل: ۱۰۶-۱۰۹)	یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں ہیں۔

یہ اس بات کی ہدایت تھی کہ حالات کی سختی کی وجہ سے اسلام کی طرف بڑھتے ہوئے قدم جانبِ کفر نہ اٹھنے لگیں۔ ورنہ اس سے دنیا کی آزمائش سے آدمی محفوظ ہو بھی جائے تو آخرت کے عذاب سے بچ نہ سکے گا۔ لیکن اگر راہِ حق کے شدائد ناقابلِ برداشت ہو جائیں اور کفر کے حق میں جنبشِ زبان سے ان سے نجات کی توقع ہو تو اس کے لیے زبان کھولی جا سکتی ہے۔ یہ ایک اجازت ہے۔ عزیمت کی راہ پھر بھی یہی ہو گی کہ آدمی آزمائشوں کے طوفان میں بھی حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اور استقامت کا ثبوت دے۔[۱]

حضرت سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو مشرکین اتنی سخت سزائیں دیتے تھے کہ وہ اپنے دین کو بظاہر چھوڑنے میں معذور سمجھے جائیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ قسم

---

[۱] قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: وھو دلیل علی جواز التکلم بالکفر عند الاکراہ وان کان الافضل ان یتجنب عنه اعزازاً للدین۔ ۱/۵۵۷ (یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جبر و اکراہ کی صورت میں کلماتِ کفر کا ادا کرنا جائز ہے گو کہ افضل یہی ہے کہ دین کی عزت و سربلندی کی خاطر اس سے اجتناب کیا جائے۔)

بخدا ! ہاں یہی صورت تھی ۔ وہ ان میں سے کسی کو مارتے ، بھوکا پیاسا رکھتے ۔ نوبت یہاں تک پہونچ جاتی کہ تکلیف کی شدت سے وہ بیٹھ نہیں پاتا تھا ۔ اس حال میں وہ اس سے جو چاہتے کہلواتے ۔ وہ سوال کرتے کہ اللہ کے بجائے لات اور عزیٰ تمہارے خدا ہیں یا نہیں ؟ وہ جواب دیتا ہاں ! یہاں تک کہ گبریلا کیڑا ان کے پاس سے گزرتا اور وہ اس سے پوچھتے کہ بجائے اللہ کے کیا یہ تمہارا خدا نہیں ہے ؟ وہ اثبات میں کہتا ہاں یہ ہمارا خدا ہے ۔ یہ سب کچھ وہ اس اذیت سے نجات پانے کے لیے کہتا جس میں وہ مبتلا ہوتا۔[1]

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ جو لوگ اسلام لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرتے ان پر مشرکین نے ظلم وزیادتی شروع کردی ، ہر قبیلہ اپنے اندر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا ۔ ان میں سے جو کم زور تھے وہ ان کو قید کرتے ، مارپیٹ اور بھوک پیاس کے عذاب میں ڈالے رکھتے ، مکہ کی ریت جب گرم ہو جاتی تو اس پر لٹا دیتے ۔ تاکہ انھیں ان کے دین سے پھیر دیں ۔ بعض لوگ شدتِ تکلیف سے ان کی بات مان لیتے تھے ۔ بعض لوگ سختی سے اپنے دین پر جمے رہتے ۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان سے بچا لیتا۔[2]

اب ذرا ان بے یار و مددگار غلاموں کا حال سنیے جنھوں نے مکہ میں اسلام قبول کیا ۔ وہ جس تعذیب اور اذیت رسانی سے گزرے ان کے تصور ہی سے انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے ۔ ان کے ساتھ جس درندگی اور حیوانیت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی ۔

حضرت بلالؓ غلام تھے ۔ وہ اسلام لائے تو ان کا مالک امیہ بن خلف ان پر غیر معمولی سختی کرنے لگا ۔ سورج کی تمازت جب بڑھ جاتی وہ انھیں ریت اور کنکروں سے بھری ہوئی مکہ کی وادی میں لٹا دیتا اور سینہ پر بڑا سا پتھر رکھ دیتا ۔ کہتا قسم خدا کی تم اسی حال میں پڑے پڑے مرجاؤ گے ۔ اس سے نجات چاہتے ہو تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ : ۱/۳۵۷ ۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ : ۱/۴۹۵ ۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ : ۴/۱۲۲

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ : ۱/۳۵۴ ۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ : ۱/۵۸۸ دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء
۱۳۸

کا انکار کر دو اور پھر سے لات و عزیٰ کی عبادت شروع کر دو۔ لیکن اس کے باوجود وہ احد، احد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کی صدا بلند کرتے رہتے۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے دین کے لیے حضرت بلالؓ نے اپنی جان کو حقیر سمجھا اور مشرکین نے بھی انھیں حقیر جانا۔ وہ ان کے گلے میں رسی باندھ کر بچوں کے ہاتھ میں دے دیتے کہ وہ ان کو مکہ کی وادیوں میں بطور تفریح لے کر گھومتے پھریں، وہ اس حال میں بھی احد احد کی صدا بلند کرتے رہتے۔ گردن میں اس کے نشان پڑ گئے تھے۔[2]

حضرت بلالؓ کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں انھیں دیکھ ایک روز حضرت ابوبکرؓ نے امیہ بن خلف سے کہا کہ کیا تم اس مسکین کے معاملہ میں خدا سے نہیں ڈرتے ہو۔ کب تک یہ ظلم جاری رہے گا؟ اس نے کہا تم ہی نے تو اسے بگاڑا ہے۔ اگر اس سے بچا سکتے ہو تو بچاؤ۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو اس سے زیادہ مضبوط اور تمہارے دین پر قائم ہے۔ اس کے بدلے تم وہ لے لو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ تمہارا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا غلام اسے دیا اور حضرت بلالؓ کو اس سے لے کر آزاد کر دیا۔[3]

حضرت خباب بن الارتؓ 'السابقون الاولون' میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں میں یہ چھٹے فرد تھے۔ انھیں برہنہ کر کے گرم ریت پر چت لٹا دیا جاتا، پتھر کو آگ میں تپا کر پشت کو داغا جاتا، سر کو ایک طرف موڑ دیا جاتا لیکن اس کے باوجود وہ دین پر ثابت قدم رہے۔ انھوں نے مشرکین کا یہ مطالبہ پورا نہیں

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ : ۱/۳۵۶

[2] مسند احمد: ۱/۶۶۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۳۳۔ برہان الدین الحلبی، السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۴۷۸ - ۴۷۹

[3] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۵۵۔ ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو قیمتاً خرید کر آزاد کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں خریدنے کی بات آئی تو فرمایا کہ ابوبکرؓ ہمیں بھی اس میں شریک کر لو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں نے انھیں آزاد کر دیا ہے۔ الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۳۲۔ امیہ بن خلف نے جس طرح سودے بازی کی اور غلام کے ساتھ جو قیمت ادا کی گئی اس سلسلہ کی روایات کے لیے ملاحظہ ہو =

کیا کہ وہ اسے ترک کردیں اور شرک کا عقیدہ اپنا لیں[1]۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کا حال دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ میری پیٹھ دیکھئے۔ دیکھا تو کہا کہ میں نے ایسی پیٹھ کبھی نہیں دیکھی۔ وہ برص کی طرح بالکل سفید تھی۔ حضرت خبابؓ نے بتایا کہ آگ دہکائی گئی اور مجھے اس پر گھسیٹا گیا۔ میرے بدن کی چربی سے آگ بجھی تھی[2]۔

حضرت صہیب بن سنان رومیؓ، عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ شروع ہی میں اسلام لے آئے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں۔

کان صہیب بن سنان من	صہیب بن سنان اہلِ ایمان کے
المستضعفین من المومنین	ان مستضعفین میں تھے جنھیں مکہ میں اللہ
الذین کانوا یعذبون فی اللہ بمکۃ[3]	کی راہ میں عذاب دیا جاتا تھا۔

حضرت صہیبؓ نے جب ہجرت کی تو قریش کے کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ صہیبؓ اپنی سواری سے اتر گئے اور کہا کہ قریش کے لوگو! تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے بڑا تیر انداز ہوں۔ میرے قریب اسی وقت آسکو گے جب کہ میرے ترکش کے تیر خالی ہو جائیں گے۔ پھر اس کے بعد، جب تک ہاتھ میں طاقت ہے تلوار چلاؤں گا۔ اگر تم میرا مال چاہتے ہو تو میں وہ بتائے دیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ حضرت صہیب نے جو مال ان کے پاس تھا وہ ان کے حوالہ کر دیا (جو مکہ میں رہ گیا ہو ممکن ہے اس کی بھی نشاندہی کر دی ہو) خالی ہاتھ مدینہ پہونچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تفصیل بتائی تو ارشاد فرمایا تم نے بڑے نفع کا سودا کیا ہے[4]۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ حضرت صہیبؓ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ تم یہاں فقیر اور تنگ دست آئے تھے۔ ہمارے ہاں تم نے بہت سامان جمع

= السیرۃ الحلبیہ: ۱/۴۸۰

[1] ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/۵۹۰

[2] ابن سعد، الطبقات: ۳/۱۶۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب ۲/۲۲۔ ابن اثیر، اسدالغابہ ۲/۱۴۷، ۱۴۸

[3] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۲۶۔ ابن اثیر، اسدالغابہ: ۳/۳۹۔ [4] حوالہ سابق۔ ۱۴۰

کیا۔اب خود بھی جانا چاہتے ہو اور اپنا مال بھی لے جانا چاہتے ہو۔قسم خدا کی دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوسکتیں۔حضرت صہیبؓ نے کہا اگر میں اپنا مال تمہارے حوالہ کردوں تو کیا تم مجھے جانے دوگے؟ انھوں نے کہا ہم اس کے لیے تیار ہیں۔انھوں نے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کیا اور مدینہ روانہ ہوگئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے دوبار فرمایا صہیب نے اچھا سودا کیا صہیب نے اچھا سودا کیا۔[1]

یاسر بن عامرؓ۔ان کی بیوی سمیہؓ،ان کے بیٹے عمارؓ اور عبداللہؓ اسلام لے آئے اس پورے خاندان کو سخت تکلیفیں دی گئیں مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر انھیں لٹادیا جاتا۔اسی تکلیف میں انھوں نے جان،جان آفریں کے حوالے کی[2]

یاسرؓ کے صاحب زادے عبداللہ کو تیر لگا اور وہ شہید ہوئے[3]

عمار بن یاسرؓ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے صہیب بن سنان رومی کو دار ارقم کے دروازے پر دیکھا۔اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر موجود تھے۔میں نے پوچھا کیا ارادہ ہے۔انھوں نے پلٹ کر میرا ارادہ معلوم کیا۔میں نے کہا کہ میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پہونچ کر ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔انھوں نے کہا کہ میں بھی اسی خیال سے آیا ہوں۔ہم دونوں آپ کی خدمت میں پہونچے آپ نے اسلام پیش فرمایا۔ہم نے قبول کرلیا۔ہم شام تک آپ ہی کے پاس رہے۔شام کو خاموشی سے باہر نکل آئے۔اس طرح حضرت عمار اور حضرت صہیب ایک ساتھ ایمان لائے۔ان دونوں سے پہلے تیس افراد اسلام لاچکے تھے[4]

راستے میں حضرت عمارؓ اپنے گھر پہونچے تو ان کے والدین نے دریافت کیا کہ وہ دن بھر کہاں رہے۔انھوں نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا اور قرآن مجید کا جو حصہ یاد کیا تھا وہ سنایا۔ان دونوں کو یہ بہت پسند آیا اور وہ ان کے ہاتھ پر اسلام لے آئے[5]

---

[1] ابن ہشام،السیرۃ النبویۃ : ۹۱/۲

[2] ابن اثیر،الکامل فی التاریخ : ۵۸۹/۱

[3] ابن حجر،الاصابہ فی تمیز الصحابۃ : ۵۰۰/۶ ۔ زرقانی علی المواہب : ۴۹۶/۱

[4] ابن سعد: الطبقات الکبریٰ : ۲۴۷/۳ ـ ۲۴۸

[5] زرقانی علی المواہب : ۴۹۶/۱

حضرت عمارؓ ان کے والد یاسرؓ اور ان کی والدہ سمیہؓ اور دوسرے مستضعفین کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میں وادیٔ بطحا سے گزرے، وہاں حضرت عمارؓ اور ان کے والدین کو سزا دی جا رہی تھی۔ آپ نے انھیں صبر کی تلقین کی اور دعا فرمائی[1]

حضرت عمارؓ کو کبھی آگ سے جلایا جاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا تو آپ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی اے آگ جس طرح تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈی ہوگئی تھی اسی طرح عمار پر بھی ٹھنڈی ہو جا۔ کبھی پتھر گرم کر کے داغا جاتا، کبھی پانی میں غوطے دئے جاتے[2]

عرصہ کے بعد ایک صاحب نے ان کی پیٹھ پر بدھیاں دیکھیں۔ جب ان سے معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ مکہ کی دھوپ میں قریش جو سزا دیتے تھے یہ اس کے نشانات ہیں[3]

اس طرح کی ہولناک سزائیں دے کر ان سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ رسولِ خداؐ کی شان میں گستاخی اور مشرکین کے معبودوں کی تعریف و توصیف کریں۔ مجبوراً ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے جنھیں وہ دل سے ناپسند کرتے تھے۔ دل ایمان پر مطمئن ہوتا اور زبان پر کفر کے کلمات ہوتے۔

جو اصحاب اس طرح کے الفاظ زبان سے نکالتے وہ بسا اوقات ہوش میں نہیں ہوتے تھے۔ انھیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟[4]

حضرت عمار بن یاسرؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کو اسلام سے پھیرنے کے لیے بنو مغیرہ کے لوگ سخت ترین سزائیں دیتے تھے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ابوجہل ان پر غصہ ہوا تو شرمگاہ میں نیزہ مارا یا ران میں نیزہ اتنے زور سے مارا کہ وہ شرمگاہ تک پہونچ گیا۔ اسی سے یہ بوڑھی اور ضعیف خاتون شہید ہوگئیں۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلی شہادت تھی جو ان کے حصہ میں آئی[5]

ابو فکیہہؓ قدیم الاسلام ہیں۔ حضرت بلالؓ اور ان کے اسلام لانے کا زمانہ ایک ہے۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ امیہ بن خلف نے ان کے پیر میں رسی باندھی اور کہا کہ اب انھیں گھسیٹ کر سخت دھوپ

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۴۸ - ۲۴۹

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۴۸ - ۲۴۹ - ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۱/ ۵۸۹

[3] ابن سعد، الطبقات: ۳/ ۲۴۸ [4] حوالہ سابق۔

[5] ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۴/ ۴۲۰ - ابن حجر، الاصابہ فی تمیز الصحابہ: ۸/ ۱۹۰

میں ڈال دو۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا قریب میں ایک گبریلا (کیڑا) رینگ رہا تھا اس نے پوچھا کیا یہ تمہارا رب نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا میرا، تمہارا اور اس کا رب اللہ ہے۔ اس نے اس بری طرح گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ اس کا بھائی ابی بن خلف بھی موجود تھا۔ اس نے کہا اور زور سے گلا دباؤ۔ اسی حال میں وہ پڑے رہے۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ ختم ہو گئے۔ بعد میں ہوش میں آئے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ بنو عبدالدار کے غلام تھے۔ وہ انھیں برہنہ کر کے لوہے کی زنجیر میں باندھ کر چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے اور ان کے (سینہ یا) پشت پر پتھر رکھ دیتے۔ ان کے ہوش باقی نہیں رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس سے ان کی زبان باہر نکل آئی تھی۔ یہ سب انھیں دین سے پھیرنے کے لیے کر رہے تھے لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو انھیں خرید کر آزاد کیا۔[۱]

بنو مؤمّل، (بنو عدی بن کعب کی ایک شاخ) کی ایک لونڈی تھی جس کا نام لُبَینہ یا لبیبہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام لے آئیں۔ حضرت عمرؓ ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ اسے سخت سزا دیتے تھے۔ تھک جاتے تو کہتے، مجھے تمہاری پٹائی پر افسوس نہیں ہے۔ تھک گیا ہوں اس لیے چھوڑ دیا ہے۔ وہ بیچاری کہتی اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے بھی خرید کر آزاد کیا۔[۲]

ایک لونڈی زُنَیرہ تھی۔ اسے بھی حضرت عمرؓ اور ابوجہل سخت سزائیں دیتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اسلام پر جمی رہیں۔ اس کی بینائی ختم ہو گئی تو مشرکین نے کہا کہ لات وعزیٰ نے اس پر یہ مصیبت ڈھائی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ لات وعزیٰ کے ہاتھ میں نفع نقصان نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کون ان کی عبادت کر رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ وہ چاہے تو میری بینائی واپس آسکتی ہے۔ دوسرے ہی دن بینائی لوٹ آئی۔ اس پر مشرکین کہنے لگے کہ یہ محمدؐ کا جادو ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے بھی خرید کر آزاد کیا۔[۳]

اسی طرح نہدیہ اور ام عبیس نامی لونڈیاں تھیں جو مشرکین کی سختیوں کا شکار تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں آزاد کیا تو انھیں ان سختیوں سے نجات ملی۔

یہ تھے وہ حالات جن سے مکہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ گزر رہے تھے اور جن میں اسلام کے فروغ اور سربلندی کی کوشش جاری تھی۔

---

[۱] ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۲۹۳/۴۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۲۲۱/۶۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۵۹۱/۱

[۲] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۳۵۶/۱۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۵۹۱/۱

[۳] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳۵۵/۱۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ۵۹۱/۱۔ شرح الزرقانی: ۵۰۲/۱ - ۵۰۳

تحقیق وتنقید

نقدِ حدیث: ضرورت وماہیت

(ایک تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر خالد ظفر اللہ داؤدی

نقدِ حدیث سے مراد بطور حدیثِ نبوی پیش آمدہ عبارت کی اصلیت وقطعیت کے لحاظ سے جانچ پڑتال کرنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت یقینی ہے یا نہیں، نیز یہ بات شانِ نبوت اور تعلیماتِ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں؟ تاکہ شرحِ صدر سے مقبول ٹھہرا کر عمل پیرا ہوا جائے یا ایمان وعمل کی سلامتی کی خاطر مردود گردانتے ہوئے بالکل لائقِ التفات نہ سمجھا جائے۔

درج ذیل تین لحاظ سے نقدِ حدیث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نقد بلحاظ ہیئتِ حدیث

۲۔ نقد بلحاظ تعداد رواۃِ حدیث

۳۔ نقد بلحاظ نفس مضمون

۱۔ نقدِ حدیث بلحاظ ہیئتِ حدیث

ہیئتِ حدیث سے مراد حدیثِ نبوی کی ظاہری شکل ہے، جو کہ سند اور متن پر مشتمل ہوتی ہے۔ "سند پر نقد خارجی نقد اور متن پر نقد داخلی نقد"[۱] کہلاتا ہے۔

الف۔ خارجی نقد (External Criticism)

(۱) حدیث اگر بطور وجادۃ[۲] نقل کی جا رہی ہے تو یہ حدیث جس تحریر، صحیفہ، کتاب یا

---

[۱] محمد تقی امینی، حدیث کا درایتی معیار، قدیم کتب خانہ، کراچی، ۱۹۸۶ء ص ۱۲۸

[۲] وجادۃ سے مراد کسی محدث کی قلم بند روایات کو نقل یا بیان کرنا ہے۔

مجموعہ سے نقل ہو رہی ہے مصنف سے اس کی نسبت کا یقینی ہونا معلوم کیا جاتا ہے۔
اگر صاحبِ کتاب کی نوکِ قلم سے نکلی ہوئی تحریر مل جائے یا شاگردوں کی تحریر پر استاد کی تصدیقی مہر ثبت ہو یا پائے جانے والے قدیم ترین نسخوں کے باہمی تقابل کے بعد یکساں ثابت ہو تو پھر یہ نسبت یقینی درجے کو پہنچ جاتی ہے اور اس حدیث کی سند کو پرکھنا ایک مفیدِ مطلب کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ کتاب کی نسبت یقینی نہ ہونے پر ایسی منقول حدیث کی سند کی پڑتال یعنی خارجی نقد کارِ عبث ہوگا۔

(۲) سندِ حدیث میں پائے جانے والے رواۃ کی دینداری کے حوالے سے عدالت، حفظ وضبط کے اعتبار سے ثقاہت اور اتصالِ سند کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اگر کسی قسم کا ضعف ثابت نہ ہو تو سند قابلِ اعتبار ورنہ ضعف کی بنا پر مردود ٹھہرتی ہے۔

(ب) داخلی نقد (Internal Criticism)

داخلی نقد میں ایجابی و سلبی پہلو دو لحاظ سے عقلی و نقلی معیاروں پر متنِ حدیث کو پرکھا جاتا ہے۔ اگر ان معیاروں پر متنِ حدیث پورا اترے تو مقبول ورنہ مردود ٹھہرے گا۔ نقد حدیث کا یہ انداز بھی محدثین کے ہاں قدیم سے پایا جاتا ہے۔ داخلی نقد کی بات دورِ حاضر کے متجددین و منکرین حدیث کی پیش کردہ کوئی نئی علمی دریافت نہیں ہے۔ داخلی نقد کا تاریخی تسلسل پیش کرنا مقالہ ہذا کی غرض و غایت ہے۔

۲۔ نقد بلحاظ تعداد رواۃ حدیث

رواۃِ حدیث کی قلت و کثرت کے لحاظ سے حدیث کی دو بڑی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

ا۔ اگر راویانِ حدیث کی ایسی کثرت ہو کہ ان کا عقلاً جھوٹ پر اجتماع محال ہو تو ایسی حدیث "حدیث متواتر" کہلاتی ہے اور کثرت رواۃ کے کذب و خطاء کے احتمال سے مبرا ہونے کی بنا پر حدیث متواتر تنقید سے بالاتر ٹھہرائی جاتی ہے۔

ب۔ اگر راویانِ حدیث کی تعداد محدود ہو اور عقلاً یا عادتاً ان کا جھوٹ پر اتفاق ممکن ہو تو ایسی حدیث "خبر واحد" کہلاتی ہے۔ خبر واحد سنداً یا متناً نقدِ حدیث کا ہدف ٹھہرتی ہے۔

۳۔ نقد بلحاظ نفسِ مضمون

زیر بحث متنِ حدیث کو نبوی یا وضعی ہونے کے پہلو سے پرکھنا اور اس کی سند و متن پر محدثین کی بحثوں میں پڑے بغیر بعض ایسے عقلی و درایتی معیاروں پر پرکھنا جن سے یہ ثابت ہو کہ آیا یہ متن واقعتاً، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ نقد اوپر ذکر کردہ داخلی نقد کی ہی ایک شکل ہے۔ اس کے ساتھ خارجی نقد کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔

نقدِ حدیث کی اس تقسیم کی درج ذیل خاکہ سے بآسانی وضاحت ہوتی ہے۔

نقد حدیث

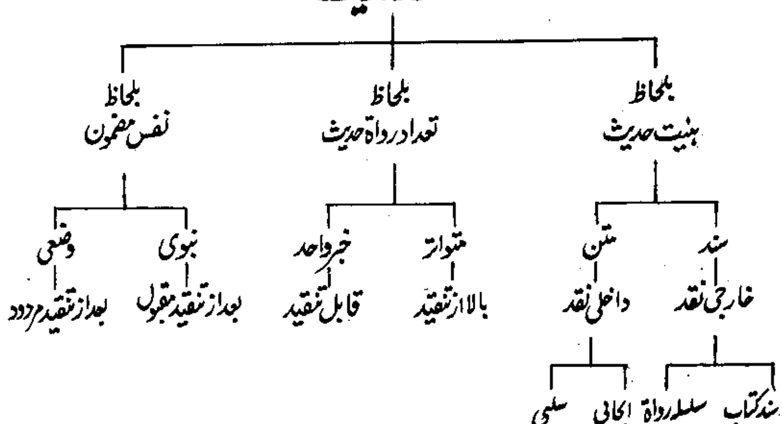

انتہائی باریک بینی اور دور اندیشی پر علوم الحدیث کا کثیر الانواع، مگر منظم و مرتب فن ایجاد کیا گیا ہے، درحقیقت یہ محدثین عظام کے نقد حدیث کے لیے قائم کردہ اصول و ضوابط ہیں۔ علوم الحدیث کی سینکڑوں سے متجاوز انواع کا علم، ہزاروں سے متجاوز رواۃِ حدیث کے احوال سے واقفیت، بے شمار کتب حدیث میں موجود متفرق متونِ حدیث پر گرفت رکھنے والے محدثین اپنے اپنے ادوار میں سند و متنِ حدیث پر نقد کر کے ہی اس کے متعلق فیصلہ کر پاتے تھے کہ کیا یہ واقعی حدیث نبوی ہے یا نہیں؟

آج ایسے قابلِ احترام وذی شان محدثین تقریباً "النادر کالمعدوم" کے درجہ میں ہیں۔ لیکن ہر مسلمان کا زندگی کے ہر موڑ پر حدیث نبوی سے تعلق ضرور رہتا ہے۔ اس لیے

بطور حدیث نبوی سامنے آنے والی عبارت کی حقیقت وحقانیت کے بارے میں قلبی اطمینان کا اولین ولولہ میں ضرور خواہاں ہوتا ہے۔ خالص محدثانہ فنی بحثیں عوام کیا خواص کے بھی بس کی بات نہیں (الا ماشاء اللہ) کیونکہ حصول علم حدیث میں کمی اور عمل میں کجی ظاہر و باہر ہے اور یہ شکوہ آج کی بات نہیں، امام صغانی (۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) بھی اپنے دور میں یہی گلہ کرتے نظر آتے ہیں[1]

حدیث نبوی کے بارے میں قدیم وجدید ہر دور کے مسلمان کی یہ خواہش ضرور رہی ہے کہ اس کے پاس چند ایسے درایتی معیار ہوں جن کی مدد سے سند ومتن کی اصولی وفنی بحثوں میں پڑے بغیر حدیث کے بارے میں صحت وضعف یا وضع کا فیصلہ کرنا ممکن ہو۔

امام ابن قیم (۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) سے جب اس نوعیت کا سوال ہوا کہ کیا نقد سند کے بغیر محض متن پر غور وفکر سے حدیث نبوی کی پہچان ممکن ہے؟ تو آپ نے نہ صرف ہاں میں جواب دیا بلکہ اپنی کتاب "المنار المنیف"[2] میں پچاس کے قریب درایتی معیاروں کی نشاندہی فرمادی۔ ان سے پہلے امام صغانی (۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) اپنی "موضوعات"[3] میں اور ان سے متقدم امام ابن جوزی (۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء) "موضوعات"[4] میں اور ان کے پیشرو جوزقانی (۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء) "کتاب الاباطیل والمناکیر"[5] میں درایتی معیاروں پر نقد حدیث کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ عقلی ودرایتی معیاروں پر نقد حدیث کا سلسلہ صحابہ کرام تک جا پہنچتا ہے۔ صحابہ نہ صرف آپس میں بلکہ تحقیق

---

[1] امام صغانی، موضوعات الصغانی، دمشق، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء تحقیق وتخریج: نجم عبدالرحمن ص ۲۴

[2] امام ابن قیم، المنار المنیف، حلب، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء، تحقیق وتخریج: عبدالفتاح ابوغدہ۔

[3] امام صغانی، موضوعات صغانی، ص ۲۸، ۳۹، ۷۰، ۱۷

[4] امام ابن جوزی، موضوعات صغانی (۳-۱) المکتبۃ السلفیہ، المدینۃ المنورۃ، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء، تقدیم وتحقیق: عبدالرحمن محمد عثمان۔

[5] ابو عبداللہ الحسین بن ابراہیم الجوزقانی، کتاب الاباطیل والمناکیر والصحاح والمشاہیر، بنارس، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، تحقیق: ڈاکٹر عبدالرحمن عبدالجبار الفریوائی۔

وتصدیق حدیث کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پوچھا کرتے تھے[1] گویا اس قسم کی خواہش یا کوشش نئی ہے نہ حدیث نبوی سے انکار و فرار ہے (اعاذنا اللہ منہ)

امت مسلمہ کے قابل فخر محنین یعنی محدثین درایتی معیاروں کو صحتِ حدیث کی پرکھ کے لیے قدیم سے استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں صحیح حدیث نبوی پر ایک نور ہوتا ہے جسے نورِ نبوت کا عرفان رکھنے والا فوراً پہچان لیتا ہے کہ یہ حدیث نبوی ہے اور وضعی روایت پر ایک ظلمت چھائی ہوتی ہے۔ اس تاریکی کی بنا پر ایسی عبارت کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر جھوٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ثقہ تابعی ربیع بن خثیم (۶۳ھ/۶۸۲ء) فرماتے ہیں:

ان من الحدیث	(حدیث نبوی میں) دن جیسی تابانی
حدیثا له ضوء کضوء النهار	و درخشانی پائی جاتی ہے۔ جس کو آدمی
نعرفه به وان من الحدیث	پہچان لیتا ہے۔ بخلاف ازیں (حدیث
حدیثا له ظلمة کظلمة	موضوع میں) ظلمت شب جیسی ظلمت
اللیل نعرفه بها[2]	ہوتی ہے جو کسی سے پوشیدہ نہیں رہتی۔

خطیب بغدادی (۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء) منافی عقل روایات کی قبولیت سے انکار کرتے ہیں۔ وہ "الکفایۃ" میں لکھتے ہیں:

ولا یقبل خبر الواحد	اگر خبر واحد سے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی
فی منافاة حکم العقل[3]	ہو جو عقل سے ٹکراتی ہو تو وہ قابل قبول نہیں۔

"تاریخ بغداد" میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں حدیث نقل کرنے کے بعد اس کے بارے میں یہ فیصلہ دیتے ہیں:

لا یثبت هذا الحدیث	اس سند کے سارے راوی ثقہ ہیں
رجال اسناده کلهم	لیکن (پھر بھی) یہ حدیث ثابت

---

[1] اعظمی، ڈاکٹر محمد مصطفیٰ، منہج النقد عند المحدثین، السعودیہ، ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء، ص ۷

[2] امام حاکم، معرفۃ علوم الحدیث، مدینہ منورہ، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء، تحقیق: ڈاکٹر سید معظم حسین، ص ۶۲

[3] خطیب بغدادی، کتاب الکفایہ فی علم الروایۃ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء، ص ۴۳۲

ثقات؎۱ نہیں۔

آپ ثقہ راویوں کی سند پر روایت کی صحت کو موقوف نہیں ٹھہراتے گویا کچھ اور عقلی و درایتی معیاروں کا بھی لحاظ کرتے ہیں۔

ابن عساکر (۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء) نے صحیح سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے۔

الحسن بن عبدالواحد القزوینی ... عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلق الورد الاحمر من عرق جبرئیل لیلۃ المعراج وخلق الورد الابیض من عرق وخلق الورد الاصفر من عرق البرق	حسن بن عبدالواحد قزوینی حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سرخ گلاب جبرئیل کے پسینے سے، سفید گلاب میرے پسینے سے اور زرد گلاب برق کے پسینے سے پیدا ہوا ہے۔

لیکن اس کے بارے میں انھوں نے یہ ردعمل ظاہر کیا ہے:

وھٰذا حدیث موضوع وضعه من لاعلم له ورکبه علی ھٰذا الاسناد الصحیح؎۲	یہ موضوع حدیث ہے اسے کسی ایسے شخص نے گھڑا ہے جسے علم حدیث سے کچھ واقفیت نہیں۔ اس نے اس پر صحیح سند جوڑ دی ہے۔

صحیح سند کے باوجود وہ اس روایت کو قبول نہیں کرتے۔کیونکہ متن کا درایتی طور پر ناقابل قبول ہونا عیاں ہے۔

ابن جوزی (۵۹۷ھ/۱۲۰۰ء) جو درایتی فکر کے علمبردار ہیں، بڑی وضاحت سے لکھتے ہیں:

الاتری انه لو اجتمع خلق من الثقات فاخبروا	اگر بہت سے ثقہ راوی متفقہ طور پر یہ خبر دیں کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے

؎۱ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، المکتبۃ السلفیہ، ج ۱۲، ص ۳۶

؎۲ ابن عساکر، تاریخ دمشق، (فوٹو کاپی) ج ۴، ص ۶۸۴

ان الجمل قد دخل فی سم الخیاط لما نفعتنا ثقتہم ولا اثرت فی خبرھم، لانھم اخبروا بمستحیل، فکل حدیث رایتہ یخالف المعقول، او یناقض الاصول، فاعلم انہ موضوع فلا تتکلف اعتبارہ	پار ہو گیا ہے تو بھی ان کی ثقاہت سے کوئی فائدہ نہیں اور اس کی وجہ سے ان کی خبر قابل قبول نہ ہو گی کیونکہ انھوں نے ایک محال چیز کی خبر دی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر وہ حدیث جو خلاف عقل اور اصول سے متعارض ہو وہ قطعاً موضوع اور ناقابل اعتبار ہے۔
واعلم انہ یجیٔ، فی کتابنا ھٰذا من الاحادیث ما لا یشك فی وضعیہ، غیرانہ لا یتعین لنا الواضع من الرواۃ، وقد یتفق رجال الحدیث کلھم ثقاۃ والحدیث موضوع ...»[1]	ہماری اس کتاب میں بعض ایسی احادیث آئیں گی جن کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ انھیں وضع کرنے والا کون ہے۔ بسا اوقات تمام راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن حدیث موضوع ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک بڑا جامع درایتی معیار یوں بیان کرتے ہیں کہ:

ان الحدیث المنکر یقشعرلہ جلد الطالب العلم منہ (وینفر) قلبہ فی الغالب ...[2]	ناقابل قبول حدیث سے طالب حدیث پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، اور دل زیادہ تر اس سے نفرت ہی کرتا ہے

علمائے اصول حدیث کے نامور نمائندہ امام ابن الصلاح (۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء) نے اس فکر کو اصولی طور پر تسلیم کرتے ہوئے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

وقد یفھمون الوضع من قرینۃ حال الراوی اوالمروی، فقد وضعت احادیث طویلۃ یشھد بوضعہ رکاکۃ	بسا اوقات علمانے حدیث راوی کا حال جان کر یا روایت دیکھ کر وضع کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ بہت سی طویل حدیثیں

---

[1] ابن جوزی، کتاب الموضوعات، ج ۱، ص ۱۰۶

[2] ابن جوزی، کتاب الموضوعات، ج ۱، ص ۱۰۳

الفاظها ومعانيها [1]	وضع کی گئی ہیں۔ ان کے الفاظ اور معانی کی رکاکت ان کے موضوع ہونے کی گواہی دیتی ہے۔

ابن دقیق العید (۷۰۲ھ / ۱۳۰۲ء) نے درایتی ملکہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

واهل الحديث كثيرًا مايحكمون بذالك باعتبار امور ترجع الى المروى والفاظ الحديث وحاصله يرجع إلى انه حصلت لهم بكثيرة محاولة الفاظ الرسول صلى الله عليه وسلم هيئة نفسانية او ملكة يعرفون بها ما يجوز ان يكون من الفاظ النبى صلى الله عليه وسلم ومالا يجوز ان يكون من الفاظه [2]	علمائے حدیث اکثر اس کا فیصلہ روایت اور الفاظ حدیث سے متعلق بعض امور کو ملحوظ رکھ کر کرتے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ رسول سے کثرتِ تعلق سے بنا پر ان کو ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ جان لیتے ہیں کہ یہ الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

اکثر مواقع پر حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ ان امور کی بناء پر کیا جاتا ہے جو کہ روایت اور الفاظ حدیث سے متعلق ہیں یعنی سند کی بجائے متن کو زیر بحث لا کر فیصلہ دینے کی فکر بکثرت کارفرما نظر آتی ہے۔

امام ذہبی (۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء) کے بعض فیصلوں میں یہ فکر نمایاں نظر آتی ہے کیونکہ پاکیزگی سند کے باوجود وہ حدیث کے بارے میں مطمئن نظر نہیں آتے اور کہتے ہیں:

وهو مع نظافة سنده منكر جدا فى نفسى منه شيئ [3]	یہ حدیث سند کی صحت کے باوجود بہت زیادہ منکر ہے۔ میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔

---

[1] ابن الصلاح، ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمٰن، مقدمۃ ابن الصلاح، فاروقی کتب خانہ، ملتان، ص ۷۴

[2] تقی الدین بن دقیق العید، الاقتراح فی بیان الاصطلاح وما اضیف الی ذلک من الاحادیث المعدودۃ من الصحاح، مطبعۃ الارشاد، بغداد ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء، دراسۃ وتحقیق: قحطان عبدالرحمٰن الدوری، ص ۲۳۱، ۲۳۲

[3] الذہبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان، میزان الاعتدال فی نقد الرجال، داراحیاء الکتب العربیۃ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء، ج ۱، ص ۱۵۱ ، ۶۲

اور کبھی وہ کسی حدیث کو ثقہ راویوں پر مشتمل سند کے باوجود قبول نہیں کرتے اور فرماتے ہیں:

رواتہ ثقات ونکارتہ بینۃ[1]	اس کے راوی ثقہ ہیں اس کے باوجود اس کا منکر ہونا واضح ہے۔

امام ابن قیم (۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) نے نقد حدیث کی اس مہارت کا ذکر یوں کیا ہے:

انما یعلم ذالک من تضلع فی معرفۃ السنن الصحیحۃ، واختلطت بلحمہ ودمہ وصار لہ ملکۃ وصارلہ اختصاص شدید بمعرفۃ السنن والآثار ومعرفۃ سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم وھدیہ فیما یامربہ وینھی عنہ ویخبر عنہ ویدعوالیہ ویحبہ ویکرھہ ویشرعہ لامۃ بحیث کانہ مخالط لہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کواحد من اصحابہ الکرام، فمثل ھذا یعرف من احوالہ وھدیہ وکلامہ ومایجوز ان یخبربہ ومالایجوز مالایعرفہ غیرہ"[2]	ایسا شخص ان کو پہچان سکتا ہے جو سنن صحیحہ سے خوب واقف ہو۔ گویا وہ اس کے گوشت پوست میں داخل ہو چکی ہوں اور معرفت سنن میں اسے خصوصیت حاصل ہو چکی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کے اخلاق سے وہ پورا واقف ہو اور جانتا ہو کہ آپؐ کیا حکم دیتے ہیں اور کس بات سے روکتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے اسے شدید تعلق ہو چکا ہو کہ گویا اسے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی طرح آپؐ سے مخالطت حاصل ہو چکی ہو تو ایسا شخص آپؐ کے احوال اور اوامر و نواہی کی خوب پہچان کر سکتا ہے۔

اس ملکہ کی بنا پر اپنی کتب میں احادیث پر حکم لگاتے ہیں مثلاً "من عشق فعف فمات فھو شھید" روایت نقل کرنے کے بعد "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں:

---

[1] الذہبی، میزان الاعتدال، ج ۱ ص ۶۲۱

[2] ابن قیم، المنار المنیف، ص ۴۴

"فلوکان اسناد ھٰذا الحدیث	اگراس حدیث کی سند سورج کی مانند
کالشمس کان غلطا و وھماً"	روشن ہوتی تب بھی وہ غلط اور باطل ہوتی۔

مزید لکھتے ہیں:

ھٰذا الحدیث لا یصح	یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	سے ثابت نہیں ہے۔ یہ آپ کا ارشاد
ولا یجوز ان یکون من کلامہ[۱۵]	نہیں ہوسکتا۔

اور "روضۃ المحبین" میں اسی حدیث کے بارے میں کہتے ہیں:

وھٰذا حدیث باطل علی	یہ حدیث قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ آپ کا
قطعًا لا یشبہ کلامہ[۲۵]	کلام ایسا نہیں ہوسکتا۔

ابن ملقن (۸۰۴ھ/ ۱۴۰۱ء) بھی داخلی نقد کے قائل ہیں اور اس کی مہارت کے بارے میں فرماتے ہیں:

ثم نہضت الجھابذۃ	پھر ماہرین فن نے ان کی پوشیدہ
بکشف عوارھا، ومحوعا،	کمزوریوں کو نمایاں کرنے کا بیڑا اٹھایا اور
وللہ الحمد، وحصل	الحمدللہ اس میں کامیاب ہوئے انھیں
لھم ملکۃ یعرفون بھا	ایسا ملکہ حاصل ہوگیا جس کے ذریعے
بھا ذلک، کما سئل بعضھم	وہ صحیح اور موضوع احادیث کو پہچان
کیف تعرفون ان الشیخ	لیتے تھے۔ ایک محدّث سے کسی نے
کذّاب؟ فقال إذا روی،	سوال کیا۔ آپ کیسے جان لیتے ہیں کہ
لا تأکلوا القرعۃ حتی	فلاں راوی جھوٹا ہے؟ انھوں نے
تذبحوھا، علمت انہ	جواب دیا: جب وہ ایسی حدیث روایت

---

۵۱ ابن قیم، زاد المعاد، المطبعۃ العربیۃ، ج ۳ ص ۱۵۴

۵۲ ابن قیم، روضۃ المحبین ونزہۃ المشاقین، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷م
تحقیق وتعلیق: الدکتور رسید الجبلی، ص ۱۹۳-۱۹۴

کذب [1]	کرتا ہے "کھیرا نہ کھاؤ جب تک کہ اسے ذبح نہ کر لو" تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہ جھوٹا ہے۔

امام بلقینی (۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء) داخلی نقد کی صلاحیت کو بڑی عمدہ مثال سے سمجھاتے ہیں:

ان انسانًا لو خدم انسانًا	اگر کوئی انسان کسی دوسرے انسان
سنین، وعرف ما یحب	کی چند سال تک خدمت کرے اور اس
وما یکرہ، فجاء انسان ادعی	کی پسند و ناپسند کو جان لے۔ پھر کوئی شخص
انہ یکرہ شیئًا یعلم ذلک انہ	آ کر اس کے بارے میں دعویٰ کرے کہ اسے
یحبہ، فبمجرد سماعہ	فلاں چیز ناپسند ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ
إلی تکذیب من قال إنہ	اسے وہ پسند ہے تو وہ اس دعویٰ کو سنتے
یکرھہ" [2]	ہی اسے رد کر دے گا۔

ابوالحسن علی الحنبلی (۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء) [3] اپنی کتاب [4] الکواکب میں فرماتے ہیں:

القلب إذا کان نقیًا نظیفًا	دل اگر صاف اور پاکیزہ ہو تو اسے
زاکیًا، کان لہ تمییز بین	حق و باطل سچ اور جھوٹ، ہدایت و گمراہی
الحق والباطل، والصدق	کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت حاصل

---

[1] ابن الملقن، سراج الدین عمر بن علی بن احمد الانصاری، المقنع فی علوم الحدیث، دار فواز للنشر المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، الاحساء، ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء، تحقیق ودراسۃ: عبداللہ بن یوسف الجدیع ج ۱ ص ۲۳۹۔

[2] البلقینی، عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح الکنانی، محاسن الاصطلاح مع مقدمۃ ابن الصلاح، مطبعۃ دار الکتب، ۱۹۷۴ء، توثیق وتحقیق: د۔ عائشہ عبدالرحمٰن (بنت الشاطی) ص ۲۱۵

[3] ابوالحسن علی بن الحسین بن عروۃ المشرقی ثم الدمشقی الحنبلی (۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء) کے بارے میں دیکھئے: شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی، الضوء اللامع لاہل القرن التاسع، دار مکتبۃ الحیاۃ بیروت، ج ۵ ص ۲۱۴-۲۱۵ (نمبر ۷۲۱) خیر الدین الزرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین بیروت، ۱۹۷۹ء، ص ۲۸۱، ایضاح المکنون میں تاریخ وفات ۱۱۱۲ھ درج ہے جو کہ غلط ہے۔

[4] الکواکب الدراری فی ترتیب مسند الامام احمد علی ابواب البخاری، دیکھئے: اسماعیل پاشا بغدادی، ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، مکتبۃ المثنی بغداد، ج ۲، ص ۳۹۰

والکذب، والھدی والضلال، ولاسیما اذا کان قد حصل له إضائة وذوق من النور النبوی، فانه حینئذ لظهر له خبایا الأمور ودسائس الاشیاء، والصحیح من السقیم ولو رکب علی متن الفاظ موضوعة علی الرسول اسناد صحیح او علی متن صحیح اسناد ضعیف لمیّز ذالك وعرفه وذاق طعمه ومیّز بین غثه وسمینه وصحیحه وسقیمه فإن الفاظ الرسول لاتخفی علی عاقل ذاقها، ولهذا قال النبی صلی الله علیه وسلم اتقوا فراسة المؤمن، فإنه ینظر بنور الله[1]

ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب اسے مشکوٰۃ نبوی سے نور اور ذوق حاصل ہو۔ اس صورت میں اس پر مخفی امور، پوشیدہ اشیاء اور صحیح وغیر صحیح میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اگر موضوع متن حدیث کے ساتھ کوئی صحیح سند یا صحیح متن کے ساتھ ضعیف سند جوڑ دی جائے تو وہ اسے پہچان لیتا ہے اور صحیح و سقیم اور قوی وضعیف کے درمیان فرق کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کسی صاحب عقل پر جو ان کا ذوق رکھتا ہو، مخفی نہیں رہ سکتے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

امام سخاوی (۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) نے ابن دقیق العید کی عبارت بعینہ نقل کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی اس فکر کے قائل ہیں[2]

امام سیوطی (۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) رقم طراز ہیں، کہ صحیح سند کے باوجود حدیث ضعیف یا کمزور ہو سکتی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: وکثیرا مایکون الحدیث ضعیفا و

لہ قاسمی، محمد جمال الدین، قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث، دار الکتب العلمیة بیروت، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، الطبعة الاولی، ص ۱۶۵۔

لہ السخاوی، شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن، فتح المغیث شرح الفیة الحدیث، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء ج ۱ ص ۲۸۶

والاسناد صحیح مرکب علیہ"[۱]

ابن عراق الکنانی (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) کے ہاں یہ فکر "تنزیہ الشریعۃ" میں درج ذیل الفاظ میں دیکھی جا سکتی ہے:

ومنہا قرینۃ فی المروی	(موضوع ہونے کا) ایک قرینہ
لمخالفتہ لمقتضی العقل	روایت میں یہ ہے کہ وہ خلافِ عقل ہو
بحیث لا یقبل التاویل و	اور اس کی تاویل نہ کی جا سکتی ہو، اس
یلتحق بہ ما یدفعہ الحس	کے مثل یہ ہے کہ وہ حس، مشاہدہ یا عادت
والمشاہدۃ او العادۃ[۲]	کے خلاف ہو۔

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) کے ہاں عقلی معیار پر احادیث کو پرکھنے اور اس معیار پر پوری نہ اترنے والی احادیث کو رد کرنے کی فکر موجود ہے وہ اپنی تائید میں ابن جوزی کا قول نقل کرتے ہیں:

لا یجوز ان یرد الشرع	ممکن نہیں کہ شریعت میں کوئی ایسی بات
بما ینافی مقتضی العقل ولذا	کہی گئی ہو جو خلاف عقل ہو۔ اسی لیے ابن
قال ابن الجوزی: کل حدیث	الجوزی فرماتے ہیں۔ ہر وہ حدیث جو عقل
رأیتہ تخالفہ العقول ....[۳]	سے ٹکراتی ہو ناقابل قبول ہے۔

علامہ قاسمی (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) فرماتے ہیں کہ داخلی نقد کے لیے پاکیزہ دل اور صاحب ملکہ ہونا ضروری ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ کلام رسول میں وہ جلالت اور شوکت ہے جو دوسرے لوگوں کے کلام میں نہیں ہوتی "کلام الرسول صلی اللہ علیہ وسلم علیہ الجلالۃ، وفیہ فحولۃ لیست لغیرہ من الناس"[۴]

---

[۱] امام سیوطی، تدریب الراوی، دار نشر الکتب الاسلامیہ، ج ۱ ص ۱۴۸

[۲] ابن عراق، ابوالحسن علی بن محمد الکنانی، تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الحدیث الشنیعۃ الموضوعۃ، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء ج ۱ ص ۶

[۳] ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ الکھنوی، ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی، الجامعۃ الاسلامیۃ اعظم گڑھ، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء، حققہ وخرج نصوصہ وعلق علیہ: الدکتور تقی الدین الندوی، ص ۴۲۴

[۴] قاسمی، قواعد التحدیث، ص ۱۶۷

داخلی نقد کے لیے بنیادی معیاری فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

وقد فرق اللہ بین	اللہ نے حق اور باطل کے درمیان ان
الحق والباطل باھل النور و	لوگوں کے ذریعے فرق کیا ہے جو نور ایمان
الایمان والنقد العارفین	اور نقد کے حامل ہیں روایات سے واقف
بالنقل، والذائقین کلام	ہیں اور عقلی طور پر ارشادات رسول کا ذوق
الرسول بالعقل [1]	رکھتے ہیں۔

"المغنی عن الحفظ والکتاب" کے مقدمہ میں محمد خضر التونسی نے داخلی نقد حدیث کے لیے محدثین کی توثیق یوں کی ہے :

"لم یقف العلما عند نقد	علماء نے نقد حدیث کے سلسلے میں
الحدیث من حیث سندہ	صرف سند سے بحث نہیں کی ہے بلکہ اس
بل تعدوا الی النظر فی متنہٗ	سے آگے بڑھ کر متن میں بھی غور کیا ہے
فقضوا علی کثیر من الاحادیث	چنانچہ انھوں نے بہت سی ایسی حدیثوں
بالوضع، وان کان سندہ	کو موضوع قرار دیا ہے جن کے متون میں
سالما اذا وجدوا فی	ایسی علتیں پائی جاتی تھیں جو انھیں
متونہا عللا تقضیٰ بعدم	ناقابل قبول قرار دیتی تھیں اگرچہ ان کی
قبولہا [2]	سندیں صحیح وسالم تھیں۔

صدیوں پر محیط تاریخ علوم حدیث میں سے صدی وار چند ایک حوالہ جات داخلی نقد حدیث کی فکر کا تاریخی تسلسل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ نیز اس سے محدثین پر جہالت پر مبنی اس اعتراض کا رد بھی ہو جاتا ہے کہ محدثین کے ہاں عقل و درایتی معیار نہیں پائے جاتے "انھوں نے زیادہ زور سند کی چھان بین پر رکھا ہے ۔متن حدیث کی طرف توجہ نہیں دی۔"[3] روایت حدیث میں محدثین نے عقل کو ذرا سا بھی روا نہیں رکھا۔

---

[1] قاسمی، قواعد التحدیث، ص ۱۶۸

[2] ابو حفص عمر بن بدر الموصلی، المغنی عن الحفظ والکتابۃ، قاہرہ، ۱۳۴۲ھ، ص ۱۰، مقدمہ از محمد خضر تونسی

[3] The Oxford Encyclopedia of the Modern Islamic World. U.S.A. 1995 Vol. 2 P. 86

بس نقل بہ نقل بلکہ مکھی پہ مکھی مارتے چلے گئے۔ حالانکہ یہ عقل محدثین کا ہی کمال ہے کہ حدیث نبوی کے نام پر سامنے آنے والے اصلی ہیرے جواہرات اور وضعی خزف ریزوں کو داخلی معیار کے کڑے اصولوں پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے اور آج حدیث نبوی کے نام پر کسی جھوٹی یا مشکوک بات کی آپ کی طرف نسبت آسان نہیں ہے۔ موضوع اور مشکوک احادیث کے بارے میں شروح حدیث کی تفصیلی فہرست اس کا بین ثبوت ہے۔ موضوع احادیث پر لکھی گئی کتب میں زیادہ تر درایتی معیاروں پر ہی ان احادیث کو رد کیا گیا ہے۔

صحیح حدیث نبوی چونکہ دین ہے[1] اس لیے محدثین نے شک و شبہ سے پاک احادیث امت تک پہنچانے کی غرض سے داخلی نقد کے علاوہ خارجی نقد کی غرض سے سند حدیث پر تنقید کا Scientific System قائم کیا، تاکہ بھرپور تیقن حاصل ہو۔

سند اور اس پر نقد کی ضرورت کا احساس بھی عقل محدثین کا ہی کمال ہے کیونکہ ہر حدیث نبوی تو صحیح بات پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن ہر صحیح بات حدیث نبوی نہیں ہوسکتی۔ اگر اس کو معیار مانا جاتا تو فزکس، کیمسٹری، ریاضی کے اصول و قوانین کے علاوہ دنیا کی ہزارہا صحیح باتیں حدیث ٹھہرتیں۔ اس لیے صحیح بات کے ساتھ بعض محدثین کے نزدیک سند کی شرط لازمی ٹھہرانا بھی عقل کا ہی تقاضا تھا۔

سند سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف عقل کو ہی اگر معیار ٹھہرایا جاتا تو بہت سی موضوع احادیث عین عقل کے مطابق ہونے کے ناطے صحیح قرار پاجاتیں۔ لیکن محدثین نے ہر روایت کے راویوں کا جائزہ لینا بھی ضروری سمجھا اور جھوٹے لوگوں کی عقل کے مطابق، اسلام کی روح کی آئینہ دار اور بظاہر صحیح احادیث کو بھی راویوں کے کذب کی بنا پر موضوع و مردود ٹھہرایا۔ علم الاسناد کی عقلی ضرورت کا بروقت احساس اور اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اس کی ایجاد و وضع اور زیر بحث لانے پر عظمت محدثین کا جس قدر اعتراف کیا جائے کم ہوگا۔[2]

---

[1] "ان ھذا الحدیث دین" محمد بن سیرین کے اس قول کے لیے دیکھئے: خلدون الاحدب، اسباب اختلاف المحدثین، الدار السعودیہ جدہ، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء، ج ۱ ص ۴۳

[2] عبدالفتاح ابوغدۃ کی "الاسناد من الدین" کا تفصیلی مطالعہ اس موضوع پر باعث اطمینان رہے گا۔

سند حدیث کو عام طور پر سراسر نقلی کاوش سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ صحیح حدیث کی شرائط کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو محدثین کے ہاں عقل کے وسیع دخل پر حیرت ہوتی ہے۔ صحیح حدیث کی شرائط میں سے عدل وضبط کی پرکھ، تجربہ اور شہادت عقل ونقل پر مبنی ہے اتصالِ سند کی شرط نقل کی متقاضی ہے عدم شذوذ کی شرط نقلی اور اجتہادی یعنی عقلی ہے۔ عدم علت کی شرط اجتہادی یعنی عقلی ہے۔ ان شرائط کا انتخاب بھی عقلی واجتہادی اور یہ شرائط بھی عقلی واجتہادی ہیں۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ محدثین کو عقل سے کیا واسطہ.... اللہ ایسی نام نہاد عقل کو عقل محدثین کا عشر عشیر ہی نصیب فرمائے تاکہ عقل کے نام پر بے عقلی کی باتیں نہ کی جائیں اور احادیث کو عقل کے نام پر رد نہ کیا جائے۔ علم حدیث سے نابلد اور عقل سلیم کی نعمت سے محروم لوگ اکثر یہ مشغلہ اپناتے نظر آتے ہیں۔ ایسے نام نہاد اہلِ علم کو امام ابن خزیمہ (۳۱۱ھ/ ۹۲۴ء) کا تیسری چوتھی صدی سے چیلنج موجود ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند سے مروی لیکن باہم متعارض کوئی بھی دو احادیث میرے علم میں نہیں ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسی دو احادیث جانتا ہو تو پیش کرے، ان کے درمیان تالیف (تعارض دور) کرتا ہوں۔[۱]

امام شافعی (۲۰۴ھ/۸۱۹ء) کی "اختلاف الحدیث" ابن قتیبہ (۲۷۶ھ/ ۸۸۹ء) کی "تاویل مختلف الحدیث" ابوجعفر طحاوی (۳۲۱ھ/۹۳۳ء) کی "مشکل الآثار" اور ابوبکر محمد بن الحسن بن فورک (۴۰۶ھ/۱۰۱۵ء) کی "مشکل الحدیث" اس فن پر عمدہ کتب ہیں اور ایسے عقلیت زدہ سکالرز کی بھلائی کا وافر مواد رکھتی ہیں۔

کج عقلی کا شکار ہو کر احادیث کو رد کرنے کی بجائے صدیوں سے مسلم اربابِ علم و فضل اور اہلِ عقل وخرد کی تسلیم کردہ روایات کو قبول کرنا دانشمندی کا تقاضا ہے یا یہ کہ انھیں رد کر دیا جائے؟ عقل کے دعوے داروں کو اس عقلی معیار پر بھی سوچنا چاہیے شاید یہ عقلی معیار، عقل میں جگہ پا جائے تو رد حدیث کے فتنہ سے بچ پائیں۔

سند کا اہتمام اور اس پر نقد یعنی خارجی نقد کا منظم سلسلہ سامنے رکھنے کے باوجود، حدیث کی پرکھ میں اس کی حیثیت بہر حال اضافی تھی کیونکہ صرف متن کی پرکھ یعنی داخلی

---

[۱] ابن قتیبہ، تاویل مختلف الحدیث، انقرہ، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵ (ترکی ترجمہ)

نقد کا معیار یہی حدیث کی جانچ پڑتال کے لیے کافی تھا۔ اسی لیے متن کی صحت اور سند کی صحت کو لازم وملزوم نہیں ٹھہرایا گیا۔ جیسا کہ:

صحة الاسناد لا تقتضي صحة المتن	سند کے صحیح ہونے سے متن کا صحیح ہونا لازم نہیں۔

کا اصول محدثین کے ہاں مسلم ہے۔ علامہ صنعانی نے "توضیح الافکار" میں تفصیلی بحث کے بعد بیان کیا ہے کہ:

والحاصل انه لا تلازم بين الاسناد والمتن إذ قد يصح السند أو يحسن لاستجماع شرائطهما ولا يصح المتن لشذوذ أو علة وقد لا يصح السند ويصح المتن من طريق أخرى[1]	حاصل یہ کہ اسناد اور متن میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ بسا اوقات تمام شروط پوری ہونے کی وجہ سے سند صحیح یا حسن ہوتی ہے لیکن متن کسی شذوذ یا علت کی وجہ سے صحیح نہیں ہوتا۔ اسی طرح بسا اوقات سند صحیح نہیں ہوتی لیکن متن کسی دوسری سند سے صحیح ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سند اور متن میں تلازم نہیں ہے۔ کبھی سند شرائطِ صحت کے اجتماع کی وجہ سے صحیح یا حسن ہو سکتی ہے۔ جبکہ متن علت و شذوذ کی بنا پر صحیح نہیں ہو سکتا اور اسی طرح کبھی سند صحیح نہیں ہوگی لیکن متن دوسری روایت (دوسرے طرق) سے صحیح ہو سکتا ہے۔

امام ابن جوزی نے واضح دوٹوک انداز میں فیصلہ دیا ہے۔

قد يكون الاسناد كله ثقات و يكون الحديث موضوعا[2]	بسا اوقات سند کے تمام راوی ثقہ ہوتے ہیں لیکن حدیث موضوع ہوتی ہے۔

امام حاکم ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] الصنعانی، محمد بن اسماعیل الامیر، توضیح الافکار، احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۶۶ھ، ج ۱ ص ۲۳۴: مزید دیکھئے الدکتور مسفر عزم اللہ، مقاییس نقد متون السنۃ، الریاض ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۷-۲۵۲
[2] ابن جوزی، موضوعات، ج ۱، ص ۹۹

هٰذا حديث رواته ائمة ثقات — اس حدیث کے تمام راوی ائمہ حدیث اور ثقہ ہیں۔

لیکن طرق کی ساری بحث کے بعد لکھتے ہیں :

فاذا الحديث موضوع [1] — لیکن حدیث موضوع ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے محدثین کے ہاں داخلی نقد کی اہمیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ وہ خارجی نقد کے ساتھ صحت حدیث کو مشروط نہیں ٹھہراتے۔ بلکہ یہ نقد تو بطور تائید و تاکید ساتھ رکھا ہے۔ امام بخاری، مسلم و دیگر محدثین کے ہاں بھی یہ اصول کارفرما ہے ان کا اپنی کتابوں میں مخالف متن کی حامل روایات کا نقل کرنا[2] اسی قبیل سے نظر آتا ہے۔ دونوں روایتوں کی اسناد صحیح قرار دی جاتی ہیں۔ لیکن ایک روایت کا متن قبول اور دوسری روایت شاذ، مقلوب المتن، مدرج، مضطرب اور معلل جیسی اصطلاحات کے ساتھ ضعیف قرار دے کر حدیث مردود کے زمرے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ حقیقت حال یہی ہے کہ دونوں سندیں صحیح ہونے پر بھی صرف ایک صحیح سند سے متن قبول اور دوسری سے مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ اب جس متن کو مرجوح قرار دیا جارہا ہے اس کی سند تو صحیح ہے۔ لیکن متن قبول نہیں یعنی سند صحیح ہونے کے باوجود متن کا ناقابل قبول ہونا ایسے ائمۃ المحدثین کے ہاں بھی موجود ہے۔ اگرچہ واضح الفاظ میں یہ درایتی انداز بیان تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

دوسری طرف بعض ایسی تعلیقات بخاری ہیں، جن کا متن امام بخاری کے نزدیک

---

[1] امام حاکم، علوم الحدیث، مدینہ منورہ، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء ص ۱۱۹ - ۱۲۰

[2] صحیح بخاری، کتاب البیوع باب شراء الدواب والحمیر (... باوقیہ) کتاب الشروط باب اذا اشترط البائع (... بوقیہ)؛ صحیح مسلم، کتاب الحج باب استحباب دخول الکعبۃ للحجاج وغیرہ، والصلوٰۃ فیہا والدعاء فی نواحیہا کلہا (.... ثم صلی) (.... فدعا ولم یصل)؛ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب المبادرۃ بالغزو (.... ان لا یصلین احد الظہر الا فی بنی قریظۃ ...) صحیح البخاری، کتاب المغازی باب رجوع النبی من الاحزاب ... (.... العصر ...)

صحیح ہے۔ سند صحیح نہ ہونے کی وجہ سے صرف تعلیقاً ذکر کر دیا ہے اور کسی دوسرے مقام پر ان کو سنداً یا موصولاً ذکر نہیں کیا ہے۔ گویا متن حدیث سند صحیح کے بغیر بھی صحیح ہو سکتا ہے اور سند کے بغیر متن کو یوں صحیح قرار دینا داخلی نقد کی بنیاد پر بھی ممکن ہے۔

"فقہ البخاری فی تراجم ابوابہ" پر تو سبھی کو فخر ہے۔ لیکن تعلیقات میں پائی جانے والی اس فکر کو کھلے دل و دماغ سے سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

محدثین کی طرح حدیث نبوی کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرنے والوں کا فریضہ ہے کہ محدثین کے ہاں سے اس فکر اور اصول کے معیاروں کو لے کر آگے بڑھیں اور دور حاضر کے حدیث نبوی کے بارے میں عقلی شکوک و شبہات، اعتراضات اور الزامات کا سامنا کریں۔ اسنادی کے ساتھ درایتی معیاروں پر دور حاضر کے مسائل کے حل کی غرض سے قائم کردہ عنوانات کے تحت تیار کردہ احادیث کے مجموعے لوگوں تک پہنچائیں۔ تاکہ وہ پیدا شدہ عقلی و فکری الجھنوں سے نجات پا کر حدیث نبوی کو انشراح صدر سے قبول کر پائیں۔

اس سے محدثین کرام کی اسناد کے سلسلہ کی ناقابل تردید کوششوں کا انکار یا بعض مخصوص لوگوں کی طرح تنقیص مطلوب نہیں، اس کے برعکس درایتی پہلو پر ان کی کوششوں کا اعتراف و اقرار اور انھیں مزید اجاگر کرنا مقصود ہے۔ محمد الصباغ فرماتے ہیں:

وانہا لابلغ رد علی اولئک الذین	یہ ان لوگوں پر زبردست رد ہے جو
یدّعون انّ علماء الحدیث	یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محدثین عظام کو نقد
لم یعرفوا النقد المتن ابداً [۱]	متن کی ذرا خبر نہ تھی۔

مزید برآں ایسے معیاروں پر تنقید حدیث کی بات سنتے ہی اسے انکار حدیث پر محمول نہ کیا جائے۔ بلکہ لوگوں کو علمی، فکری اور تاریخی طور پر آگاہ کیا جائے کہ محدثین نے اس پہلو کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا تھا اس کی ضرورت و اہمیت کی بناء پر اسے اولیت دی تھی۔ آج جو درایتی معیاروں اور داخلی نقد کے بہانے انکار حدیث اور تنقیص محدثین کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ یہ تاریخی بے خبری اور حدیث نبوی سے دوری کی بناء پر ہے حقیقت

---

[۱] ملا علی قاری، الموضوعات الکبری، المکتبۃ الاثریہ سانگلہ ہل، ص ۱۱، مقدمہ از محمد الصباغ

اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ صدیوں بیشتر محدثین کے ہاں سب کچھ موجود ہے۔[1] آج کے متجددین اور منکرین حدیث کے باوا آدم گولڈ زیہر[2] اور پھر اس کے اگلے ہوئے نوالے کو چبانے والے غاستون وایت[3]، گلیوم[4]، احمد امین مصری[5] اور برصغیر میں ان کے پیروکاروں کی یہ نئی علمی دریافت نہیں ہے۔ اس حقیقت سے بھی آگاہ رہنا چاہیے کہ آج درایتی معیاروں کے حوالے سے جن صحیح احادیث کو رد کیا جاتا ہے محدثین کرام ان میں سے ہر حدیث کی الگ سے درایتی معیاروں پر قابل قبول تشریح و توضیح کر چکے ہیں اور ایک بھی ایسی متنازعہ حدیث نہیں ہے جس کی عقلی معیاروں پر قبولیت کا سامان تشریحات محدثین میں نہ پایا جاتا ہو۔ تحصیل علم حدیث اور مطالعہ کتب اسلاف کی بجائے علمی رسوخ اور عقلی فراست کی کمی کا ازالہ انکار و فرار کی آسان راہ میں تلاش کرنا، شعار ایمانی یا شیوہ مردانگی نہیں ہے۔

محدثین کے ہاں داخلی نقد اور درایتی ملکہ کے تاریخی ثبوت سے ہر کس و ناکس کے لیے اس مہارت کی راہ نکالنا گنجائش پیدا کرنا طفلانہ ذہنیت یا بچگانہ سوچ ہوگی ہر فن میں ماہر ہی متعلقہ مہارت کا اہل ہوتا ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی کی جانچ پڑتال اور پرکھ کے لیے درایتی بصیرت بھی حدیث نبوی سے گہری واقفیت اور انتہائی شغف والے کا ہی نصیب ہے جیسا کہ ڈاکٹر لقمان سلفی نے لکھا ہے :۔

---

۱ الدکتور فاروق حمادہ، المنہج الاسلامی فی الجرح والتعدیل۔ الرباط۔ ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء، ص ۳۸۰۔ الدکتور نورالدین عتر، منہج النقد فی علوم الحدیث، دارالفکر، ص ۴۴۲

۲ گولڈ زیہر کی زہریلی سوچ اور تحقیقی کوتاہی کے لیے دیکھیے: الدکتور محمد طاہر الجوابی، جہود المحدثین فی نقد متن الحدیث النبوی الشریف، تونس، ۱۹۹۱ء ص ۴۵۰-۴۵۳

۳ الدکتور محمد عجاج الخطیب، السنۃ قبل التدوین، دارالفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء ص ۲۵۴-۲۵۵

۴ Alfred Guillaunm, The Tradition of Islam (Oxford, 1924) P. 80

الدکتور شرف الدین علی الراجحی، مصطلح الحدیث و أثرہ علی الدرس اللغوی عند العرب، دارالنہضۃ العربیۃ بیروت ۱۹۸۳ء ص ۱۸۸

۵ الجوابی، جہود المحدثین ... ص ۴۵۱-۴۵۴؛ مرتب: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء، ج ۲ ص ۲۵۲-۲۶۱، مقالہ: علم حدیث اور مستشرقین از ڈاکٹر تقی الدین الندوی۔

"لیکن اس مقامِ عالی کا اہل ہر وہ شخص نہیں ہے جس نے حدیث سے خوشہ چینی کی ہو اور اس میدان میں ہر کس وناکس کی بات قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کام بہت اہمیت کا حامل اور نازک ہے اس لیے ہر دعوے دار کو احادیث پر تنقیدی نظر ڈالنے اور وضع پر دلالت کرنے والے اشارات متعین کرنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ یہ فن اس میں رچ بس نہ گیا ہو۔

اس عقلی مہارت اور درایتی بصیرت کے حصول پر حدیث ابی اسید الساعدی سے گنجائش ملتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا سمعتم الحدیث تعرفه قلوبکم وتلین له اشعارکم وابشارکم وترون انه منکم قریب فانا اولاکم به، واذا سمعتم الحدیث عنی تنکره قلوبکم و تنفر منه اشعارکم و ابشارکم، وترون انه منکم بعید، فانا ابعدکم منه"[۱]	جب تم کوئی حدیث سنو اور اس سے تمہارے دل مانوس ہوں تمہارے اندر خشوع وخضوع پیدا ہو اور تم اس سے قربت محسوس کرو تو جان لو کہ وہ میری کہی ہوئی بات ہے اور جب تم کوئی ایسی حدیث سنو جس سے تمہارے دل نامانوس ہوں تمہارے اندر اس سے ناگواری پیدا ہو اور تمہیں وہ بات بعید معلوم ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میری کہی ہوئی بات نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے:

ما حدثتم منی مما تنکرونه فلا تأخذوا به فانی لا اقول المنکر ولست من اهله[۲]	جب تم سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جو تمہارے نزدیک ناگوار اور ناپسندیدہ بات پر مشتمل ہو تو اسے قبول نہ کرو اس لیے کہ میں کوئی منکر بات نہیں کہتا یہ میری شان نہیں۔

---

[۱] مسند احمد، ج ۳ ص ۴۹۷ عن ابی اسید الساعدی، علامہ البانی، سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، ج ۲ ص ۳۶۹-۳۷۰۔
[۲] ابن عراق، تنزیۃ الشریعۃ، ص ۷

تاہم اس ملکہ کے حصول کے بعد حدیث کی فوری پہچان ممکن ہے، جیساکہ امام ابن قیم بطریق اویس قرنی دعائیہ کلمات نقل کرنے کے بعد مختلف طریق بیان کرتے ہیں اور آخر میں یوں رقم طراز ہیں :

وھٰذا امثاله ؛ مما لا يرتاب من له ادنى معرفة بالرسول صلى الله عليه وسلم وكلامه انه موضوع مختلق وافك مفرى عليه [1]	جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ارشادات کے بارے میں مروی کسی بھی معرفت ہوا سے اس طرح کی احادیث کے بارے میں معمولی سا بھی شک نہ ہوگا کہ وہ موضوع اور من گھڑت ہیں۔

وہ مزید فرماتے ہیں :

الاحاديث الموضوعة عليها ظلمة وركاكة ومجازفات باردة تنادى على وضعها واختلاقها على رسول الله صلى الله عليه وسلم [2]	موضوع احادیث پر تاریکی چھائی ہوئی ہوتی ہے اور ان میں رکاکت پائی جاتی ہے اور ان میں مہمل باتیں ہوتی ہیں جو اعلان کرتی ہیں کہ وہ من گھڑت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ان کا انتساب صحیح نہیں۔

ڈاکٹر عصام احمد البشیر فرماتے ہیں:

لان لحديث النبیؐ اشراقا ونورا فكل كلام خرج من جودة الفصاحة وبلاغة المعنى وجزالة اللفظ وحسن البيان فليس من مقولة عليه السلام [3]	حدیث نبوی میں ایک نور ہوتا ہے ہر وہ کلام جو فصاحت وبلاغت الفاظ کی روانی اور حسن بیان سے خارج ہو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہوسکتا۔

عقلی ودرایتی پہچان کے حوالے سے سب سے خوبصورت، مبنی برحقیقت

---

[1] ابن قیم، المنار المنیف، ص ۴۵

[2] ابن قیم، المنار المنیف، ص ۵۰

[3] عصام احمد البشیر، اصول منہج النقد عند اہل الحدیث، (بیروت ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) ص ۹۷

اور جامع بات ابن جوزی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فکل حدیث رایته یخالف	ہر وہ حدیث جو عقل سلیم کے منافی اور
المعقول او یناقض الاصول	اصول دینیہ کے متناقض نظر آئے جان لو
فاعلم انه موضوع فلا تتکلف	کہ وہ من گھڑت ہے۔ اس کا بالکل اعتبار
اعتبارہ[1]	نہ کرو۔

---

[1] ابن جوزی، کتاب الموضوعات، ج ۱، ص ۱۰۶

اسلامی نظام معاشرت پر اعتراضات کا مسکت جواب

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

مولانا سید جلال الدین عمری

اس کتاب میں اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ پر مخالفین کے اعتراضات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور بہت مدلل انداز میں ان کا رد کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسلام کے زیر سایہ عورت کو حاصل حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں مہر نفقہ، تعدد ازدواج، طلاق، نفقہ مطلقہ، خلع، حجاب، وراثت، قصاص، دیت، شہادت، خاندان کی سربراہی اور سیاسی قیادت جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ مصنف نے بدلائل واضح کیا ہے کہ ان تمام مسائل میں اسلام نے عورت کی مخصوص جسمانی صلاحیت اور طبعی رجحانات و میلانات کی بھرپور رعایت کی ہے اور اس کے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن رکھا ہے۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۶۰ روپے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی نے The Rights of MUSLIM WOMAN - An Appraisal کے نام سے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۲۳۴ قیمت مجلد ۷۰ روپے

اس کا ہندی ترجمہ بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

ملنے کے پتے

(۱) ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔ ۱

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ابوالفضل انکلیو۔ نئی دہلی۔ ۲۵

بحث و نظر

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی

اعتراضات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اسلام کے مخالفین کی ایک کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو داغ دار کر دیں اور اسے انتہائی گھناؤنی شکل میں پیش کریں۔ یہ کوشش ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی جانب سے بھی کی جاتی رہی ہے اور نام نہاد ہندو پرچارکوں کی جانب سے بھی۔ ان لوگوں نے سیرتِ نبوی کے ازدواجی پہلو کو خاص طور سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی کثرت کا سبب آپؐ کی خواہش نفسانی کا غلبہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض دیگر اعتراضات بھی کیے ہیں سطورِ ذیل میں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

ازواجِ مطہرات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہؓ ازواج تھیں۔ ان میں سے دو (حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینبؓ بنتِ خزیمہؓ) کا انتقال آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہو گیا تھا۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام زوجہ	حضورؐ کی زوجیت میں آنے سے قبل کس کے نکاح میں رہیں؟	نکاح کے وقت حضورؐ کی عمر
۱۔	حضرت خدیجہؓ	(۱) عتیق بن عائذ (۲) ابو ہالہ	۲۵ سال (حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال)
۲۔	حضرت سودہؓ	سکران بن عمرو بن عبدودؓ	۵۰ سال

۳۔	حضرت عائشہؓ	×	۵۳ سال (بوقت رخصتی حضرت عائشہؓ)
۴۔	حضرت حفصہؓ	خُنیس بن حذافہ سلمیؓ	۵۵ سال
۵۔	حضرت زینب بنت خزیمہؓ	(۱) طفیل بن حارث بن عبد المطلبؓ (۲) عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلبؓ (۳) عبداللہ بن جحشؓ	۵۵ سال
۶۔	حضرت ام سلمہؓ	عبداللہ بن عبد الاسد (ابوسلمہؓ)	۵۶ سال
۷۔	حضرت زینبؓ بنت جحش	زید بن حارثہؓ	۵۷ سال
۸۔	حضرت جویریہؓ	مسافع بن صفوان	۵۷ سال
۹۔	حضرت ام حبیبہؓ	عبید اللہ بن جحش	۵۸ سال
۱۰۔	حضرت صفیہؓ	(۱) سلاّم بن مشکم قرظی (۲) کنانہ بن ابی حقیق	۵۹ سال
۱۱۔	حضرت میمونہؓ	(۱) مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفیؓ / حویطب بن عبد العزیٰ (۲) ابورہم بن عبد العزیٰؓ	۵۹ سال

حضورؐ کی ازدواجی زندگی پر ایک نظر

گزشتہ تفصیل سے چند باتیں بہت ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس۲۵ سال کا عرصہ تجرّد اور عفت و پاک بازی سے گزارا

(۲) پچیس۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون (حضرت خدیجہؓ) سے نکاح کیا جو عمر میں آپؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ آپ سے پہلے یکے بعد دیگرے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی تھیں اور صاحبِ اولاد تھیں۔

(۳) پچاس۵۰ سال کی عمر تک (یعنی پورے پچیس۲۵ سال) اسی ایک رفیقۂ حیات پر قانع رہے اور کسی دوسری خاتون سے نکاح کی خواہش تک کا اظہار کبھی نہیں ہوا۔

(۴) حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد، اپنی عمر کے پچاسویں سال جس خاتون (حضرت سودہؓ) سے نکاح کیا وہ آپ کی ہم سن اور بیوہ تھیں۔

(۵) بقیہ نوازواجِ مطہرات سے آپؐ کا نکاح ترپنؐ سال کی عمر سے ساٹھ سال کی عمر کے درمیانی عرصہ میں ہوا۔ یہ ساری خواتین (سوائے ایک حضرت عائشہؓ کے) ایک، دو یا تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی تھیں۔

(۶) اپنی عمر کے آخری تین سالوں میں جب کہ جزیرۃ العرب کے بڑے حصے پر آپ کا اقتدار قائم ہوچکا تھا، آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

درج بالا تفصیلات معترضین کے اس اعتراض کی جڑ کاٹ دیتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازدواج کا سبب خواہشِ نفسانی کا غلبہ تھا۔ کیا یہ الزام اس شخص پر لگایا جاسکتا ہے جس نے اپنی جوانی کے ایّام صرف ایک خاتون کی رفاقت میں گزارے ہوں اور وہ بھی ایسی جو عمر میں اس سے پندرہ سال بڑی ہو اور اس سے پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہو!؟

اس مسئلہ پر دو اور پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ اگر آپؐ پر خواہشِ نفسانی کا غلبہ تھا تو اس کی تکمیل کا بہترین موقع وہ تھا جب دعویٔ نبوت کے پانچویں چھٹے سال آپ کے مخالفین آپ کی دعوت کو روکنے میں پورا زور لگا رہے تھے اور آپ کے سامنے پیش کش کر رہے تھے کہ اگر تمہاری اس دعوت کا کوئی دنیاوی مقصد ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں، تمہارے قدموں میں مال و دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور عرب کی حسین ترین عورت سے تمہارا نکاح کیے دیتے ہیں، لیکن آپؐ نے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا[۱] اس وقت آپ کے نکاح میں پچپنؐ سال کی ایک بوڑھی خاتون (حضرت خدیجہؓ) تھیں۔

دوسرے یہ کہ حضور کے زمانے میں آپؐ کے مخالفین نے آپؐ پر طرح طرح کے الزامات لگائے، شاعر کہا، ساحر کہا، مجنون اور سحر زدہ کہا، خواہشِ اقتدار کا طعنہ دیا اور دوسرے الزامات عائد کیے مگر آپ کے کٹّر سے کٹّر دشمن کو بھی آپ پر نفسانی ہوس کا الزام لگانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ اگر انھوں نے آپ کی ذات میں اس کا ادنیٰ سا بھی شائبہ محسوس کیا ہوتا تو آپ کے خلاف پروپیگنڈا کا ان کے ہاتھ اس سے بہتر حربہ اور کوئی نہ آسکتا تھا۔

---

[۱] جامع البیان فی تفسیر القرآن۔ ابن جریر طبری، المطبعۃ المیمنیہ مصر جزء ۳۰ ص ۱۸۷ (عن ابن عباس)

کثرتِ ازواج معیوب نہیں تھی

قدیم زمانے میں کثرتِ ازواج معیوب نہیں تھی مختلف پیغمبروں کی ایک سے زیادہ ازواج ہونا ثابت ہے۔ اسی طرح مختلف قوموں کے برگزیدہ اور سربرآوردہ لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے مثلاً:

حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں۔ سارہ، ہاجرہ اور قتورہ (پیدائش ۱۶ : ۲۴، ۱۸ : ۱۵، ۲۵ : ۱)

حضرت یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں۔ لیاہ، زلفہ، زاخل اور بلہاہ (پیدائش ۲۹: ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹)

حضرت موسیٰؑ کی چار بیویاں تھیں۔ صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب (خروج: ۲ : ۲۱، قاضیوں ۱ : ۱۶، ۴ : ۱۶)

حضرت داؤدؑ کی نو بیویوں کا نام ملتا ہے۔ (سموئیل اول ۱۸ : ۲۷، سموئیل دوم ۳ : ۲ - ۵، ۵ : ۱۳، ۱۱ : ۲۶)

حضرت سلیمانؑ کی سات سو بیویوں اور تین سو حرموں کا تذکرہ ملتا ہے (سلاطین اول ۱۱ : ۳)

راجہ دسرتھ کی تین بیویاں تھیں۔ پٹ رانی کوشلیہ، رانی سمترا اور رانی کیکئی۔
کرشن جی کی لاتعداد گوپیوں کے علاوہ ان کی رانیوں کی تعداد اٹھارہ تھی۔
راجہ پانڈو کی دو بیویاں تھیں[1]

عہدِ جاہلیت میں بھی بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ لوگ جتنی عورتوں سے چاہتے نکاح کر لیتے تھے۔ قبیلۂ ثقیف کے ایک رئیس غیلان بن سلمہ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت اس کے نکاح میں دس عورتیں تھیں[2]۔ حارث بن قیس بن عمیرۃ الاسدی کے نکاح

---

[1] رحمۃ للعالمین، قاضی محمد سلیمان منصورپوری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۲/۱۴۸ - ۱۵۲

[2] جامع ترمذی ابواب النکاح باب ماجاء فی الرجل یسلم وعندہ عشر نسوۃ، سنن ابن ماجہ ابواب النکاح باب الرجل یسلم وعندہ اکثر من اربع نسوۃ۔

میں آٹھ عورتیں تھیں[1]۔ نوفل بن معاویہ الدیلی کے یہاں پانچ عورتیں تھیں[2]۔ مورخ ابن حبیب نے قبیلۂ ثقیف کے ایسے متعدد افراد کا تذکرہ کیا ہے جن کے نکاح میں بعثتِ نبوی کے وقت دس دس عورتیں تھیں[3]۔

قرآن نے چار کی حد مقرر کی

قرآن نے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی اور اس کو بھی عدل کی شرط سے مشروط کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ	تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں
النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ	سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرو
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً	لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کر ان کے ساتھ عدل
(النساء: ۳)	نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

چنانچہ جن لوگوں کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ ان میں سے جن چار کو چاہیں بیوی کی حیثیت سے باقی رکھیں بقیہ کو طلاق دے دیں[4]۔

نبیؐ کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا

آیتِ بالا کے نزول کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی چار ازواجِ مطہرات (حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ) تھیں۔ (حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ کا انتقال ہوچکا تھا) لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس حکم سے مستثنیٰ رکھا اور آپ کو چار سے زیادہ خواتین سے نکاح کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ

---

[1] سنن ابو داؤد، کتاب النکاح باب من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع، سنن ابن ماجہ۔ حوالۂ سابق

[2] تفسیر کبیر رازی۔ المطبعۃ العامرہ، مصر ۲/۱۴۲، تفسیر ابن کثیر المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، مصر ۱/۴۵۱ بحوالہ مسند امام شافعی

[3] المحبر، محمد بن حبیب بغدادی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۴۲ء ص ۳۵۷

[4] جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، المحبر حوالہ سابق۔

آپ نے جب پانچویں خاتون (حضرت زینب بنت جحشؓ) سے نکاح کیا اس وقت قدرتی طور پر بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھا ہوگا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دوسروں کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ناجائز قرار دیتے ہیں تو خود یہ پانچواں نکاح کیسے کر لیا۔ ممکن ہے بعض مخالفوں نے اس کو بنیاد بنا کر فتنہ پھیلانے کی کوشش کی ہو۔ اس موقع پر قرآن نے صراحت کی کہ تعدّد ازواج کی اس تحدید سے آپ مستثنیٰ ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ	اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال
أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ	کردیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم
وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ	نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ
اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ	کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت
وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ	میں آئیں اور تمہاری وہ چچازاد اور پھوپھی زاد
خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ	اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے
اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَ	تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن
امْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ	عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے
نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ	ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے۔
أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ	یہ رعایت خاص تمہارے لیے ہے۔ دوسرے
مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ	مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہم کو معلوم ہے
عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ	کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں
فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ	کے بارے میں کیا حدود عائد کیے ہیں۔
أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ	(تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے
حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا	مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ تمہارے اوپر کوئی تنگی
(الاحزاب: ۵۰)	نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تعدّد ازواج کے سلسلے میں عام قاعدے سے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ (خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ) ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بیان کر دی گئی ہے اور وہ یہ کہ "آپ کے اوپر کوئی تنگی نہ رہے"

(لِکَیۡلَا یَکُوۡنَ عَلَیۡکَ حَرَجٌ) "تنگی" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپ کی خواہشاتِ نفس بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، ان کی تکمیل کے لیے آپ کو چار کی قید سے آزاد رکھا گیا اور اجازت دی گئی کہ جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کریں تاکہ چار بیویوں تک محدود رہنے میں آپ تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر دینِ حق کی تبلیغ واشاعت کی جو عظیم ذمہ داری عائد کی تھی اور جس ماحول میں آپ اسے سرانجام دے رہے تھے یہ دونوں چیزیں جس شخص کی نظر میں ہوں وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ عام قاعدے سے آپ کو مستثنیٰ رکھنا کیوں ضروری تھا؛ اور چار کی قید میں آپ کے لیے کیا "تنگی" تھی؟

کثرتِ ازواج کے مصالح

ان تفصیلات سے اس اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرتِ ازواج کا سبب آپؐ کی بڑھی ہوئی نفسانی خواہش تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کے کیا مصالح تھے؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں غور کرنے سے درج ذیل مصالح سامنے آتے ہیں:

الف: اصحاب کی دل جوئی

دین کی تبلیغ واشاعت کی راہ میں بعض صحابہ اور صحابیات نے غیر معمولی قربانیاں دی تھیں اور ان کی نصرت اور تعاون سے آپ کو بہت سہارا ملا تھا۔ آپؐ نے ان کی دل جوئی کرنے، ان کی رفاقت کو پختہ تر کرنے اور ان کی قدر افزائی کے لیے بعض نکاح کیے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ آپ کے قریب ترین اصحاب تھے۔ آپؐ نے ان کی دل جوئی اور قدر دانی کے لیے ان کی صاحب زادیوں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے نکاح کیا۔ حضرت سودہؓ ابتدائی عہد میں اسلام قبول کرنے اور حبشہ ہجرت کرنے والوں میں سے تھیں۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے سخت آزمائشیں جھیلی تھیں۔ ان کی سبقتِ اسلام، ہجرتِ حبشہ اور قربانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے حضور نے ان سے نکاح کیا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی اور

حضور کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس سالہ بیوہ سے نکاح میں جنسی محرک کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کے تیسرے شوہر عبداللہ بن جحشؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ وہ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تو آپؐ نے قرابت کا لحاظ کرتے ہوئے اور غزوۂ احد میں بڑی تعداد میں صحابہ کے شہید ہو جانے سے پیدا ہونے والی سماجی پیچیدگی کو دور کرنے کے لیے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر حضرت ابو سلمہؓ حضورؐ کے رضاعی بھائی اور السابقون الاولون میں سے تھے۔ انھوں نے حبشہ ہجرت کی تھی، پھر وہاں سے واپس آکر ہجرتِ مدینہ کا شرف بھی حاصل کیا تھا اور اس میں اپنی بیوی اور بچے سے طویل عرصہ تک جدائی بھی برداشت کی تھی۔ انھوں نے غزوۂ احد میں زخمی ہونے کے بعد وفات پائی، اس وقت ان کے چار بچے تھے۔ حضور نے زوجین کی بے مثال قربانیوں کی قدر افزائی اور بچوں کی کفالت کے مقصد سے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کیا۔ اسی طرح حضرت زینب بنتِ جحشؓ سے آپؐ نے ان کی دل شکنی اور ذہنی اذیت کی تلافی کے لیے نکاح کیا تھا (نکاحِ زینب کے دیگر مصالح پر بحث آگے آئے گی)

ب۔ دین کی توسیع اور استحکام

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس زمانے میں عرب میں قبائلی نظام بڑا مستحکم تھا۔ اپنے کسی فرد کی حمایت میں عموماً پورا قبیلہ متحد ہو جاتا تھا۔ کفار نے جب آپؐ کا معاشی بائیکاٹ کیا تو پورے بنو ہاشم نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج الگ الگ قبیلوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

۱۔ حضرت خدیجہؓ	بنو عُزّیٰ
۲۔ حضرت سودہؓ	بنو عامر
۳۔ حضرت عائشہؓ	بنو تیم
۴۔ حضرت حفصہؓ	بنو عدی
۵۔ حضرت زینب بنتِ خزیمہؓ	بنو ہلال
۶۔ حضرت ام سلمہؓ	بنو مخزوم

۷۔ حضرت زینب بنت جحشؓ	بنو اسد
۸۔ حضرت جویریہؓ	بنو مصطلق
۹۔ حضرت صفیہؓ	بنو ہارون
۱۰۔ حضرت ام حبیبہؓ	بنو امیہ
۱۱۔ حضرت میمونہؓ	بنو عیلان

مختلف قبائل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کرنے سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ان قبائل سے قربت پیدا ہوئی، انھوں نے سنجیدگی سے اسلام کے بارے میں غور کیا اور اسے قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس طرح مختصر مدت میں دین کی توسیع اور استحکام کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

ج۔ عداوتوں کا خاتمہ

ان نکاحوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جن قبائل اور خاندانوں سے آپؐ کے سسرالی رشتے قائم ہوئے انھوں نے اپنی عداوتیں ختم کردیں اور آپؐ کے خلاف ان کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑگئیں۔

حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیانؓ کی بیٹی تھیں جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر موقع پر لشکر کی قیادت کی تھی لیکن ان سے آپؐ کے نکاح کے بعد ان کے باپ کی مخالفت کم زور پڑگئی اور وہ پھر کبھی آپؐ کے مقابلے پر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اور ان کے دونوں فرزند حضرت معاویہؓ اور حضرت یزیدؓ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ حضرت جویریہؓ قبیلۂ بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، ان سے نکاح کے بعد ان کا پورا قبیلہ رہزنی سے تائب ہوکر مسلمان ہوگیا۔ حضرت صفیہؓ کا تعلق یہود کے اس قبیلے سے تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے جاملتا ہے۔ ان کے امہات المومنین میں شامل ہونے سے یہود کی سازشوں کو کم کرنے میں مدد ملی۔

د۔ عورتوں کی تعلیم وتربیت

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم مقصد کو لے کر مبعوث ہوئے تھے اس کے لیے

صرف مردوں کی تعلیم وتربیت کافی نہیں تھی بلکہ عورتوں کی تعلیم وتربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ لیکن چونکہ اسلامی معاشرت میں مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع تھا اس لیے عورتوں کی براہِ راست تعلیم وتربیت کے لیے زیادہ وقت فارغ کرنا آپؐ کے لیے ممکن نہ تھا۔ دوسرے، بہت سے نسوانی مسائل ایسے ہیں جن کو علی الاعلان یا عورتوں کے سامنے کھول کر بیان کرنے میں حیا مانع ہوتی ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ کنواری پردہ نشین سے زیادہ حیادار تھے[۱] اس بنا پر عورتوں کی تعلیم وتربیت کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ مختلف خواتین سے نکاح کرکے ان کی براہ راست تعلیم وتربیت کریں اور انھیں دوسری عورتوں کو دین سکھانے کے لیے تیار کریں۔ نسوانی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی کردار ہے۔ انھوں نے وہ مسائل خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرکے دوسری صحابیات کو بتائے، یا صحابیات ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کرتی تھیں تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرکے انھیں جواب دیتی تھیں۔

مخصوص مسائل سے ہٹ کر بھی بہت سی تعلیمات اور احکام کا علم امت کو ازواجِ مطہرات ہی کے واسطے سے ہوا ہے۔ وہ خلوت گاہِ نبوت کی رازدار تھیں۔ انھیں بہت سی ان باتوں کی خبر رہتی تھی جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔ دین کی بہت سی تعلیمات انھوں نے خود رسول اللہ سے دریافت کرکے حاصل کیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں مستفید فرماتے رہتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کی معتد بہ تعداد ایسی ہے جو ہم تک صرف ازواجِ مطہرات کے ذریعے سے پہنچی ہے۔

۵۔ حسن معاشرت کا اعلیٰ نمونہ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازدواجی زندگی کے ذریعے حسنِ معاشرت کا

۱؎ صحیح بخاری، کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحیح مسلم کتاب الفضائل۔

اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ آپ کی ازواج مختلف قبائل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی عمریں بھی متفاوت تھیں اور ان کے مزاجوں میں بھی فرق تھا۔ ان میں ایک کنواری تھی اور ایک مطلقہ۔ ان میں ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی تھیں، دُو دُو شوہروں کی بیوائیں بھی اور تین شوہروں کی بیوہ بھی۔ لیکن ان کے درمیان پوری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کے تعلقات آپس میں بھی ہمیشہ خوش گوار رہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات بھی مثالی رہے۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ اس شخص کے لیے بھی زندہ نمونہ ہے جس کا نکاح اپنے سے بڑی اور پختہ عمر کی عورت کے ساتھ ہوا ہو کہ اس کے ساتھ کیسی خوش گوار ازدواجی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور اس شخص کے لیے بھی جس کی بیوی نوعمر ہو کہ کس طرح اس کی دل داری کی جاتی ہے۔ آپ کی زندگی ہر شخص کے لیے اسوہ ہے خواہ اس کا نکاح کنواری سے ہوا ہو یا مطلقہ سے، کسی صاحبِ اولاد بیوہ سے ہوا ہو یا بے اولاد بیوہ سے۔ آپؐ کی کثرتِ ازواج کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس طرح مختلف پہلوؤں سے آپ کا اسوہ نمایاں ہو اور ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے اس سے رہنمائی حاصل کرسکے۔

حضورؐ پر عائد بعض پابندیاں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ بیویوں کے سلسلے میں چار کی قید سے آزاد رکھا گیا تھا لیکن آپ پر بعض پابندیاں عائد کردی گئی تھیں۔ یہ پابندیاں ایسی تھیں جن سے آپؐ کی امت آزاد تھی۔ مثلاً:

۱۔ ہر مسلمان کے لیے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے بلا کسی قید کے نکاح جائز ہے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان میں سے صرف انھی سے نکاح جائز قرار دیا گیا جنھوں نے مدینہ ہجرت کی ہو۔ ارشاد ہے:

وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ	اور (اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال
وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ	کردیں) تمہاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور
الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ	ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمہارے
(الاحزاب: ۵۰)	ساتھ ہجرت کی ہے۔

چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے محبوب چچا جناب ابوطالب کی بیٹی امّ ہانیؓ سے نکاح کے خواہش مند تھے مگر یہ اس لیے ممکن نہ ہوسکا کیونکہ انھوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی اور وہ "طلقاء" (فتحِ مکہ کے موقع پر ایمان لانے والوں) میں سے تھیں۔[1]

۲۔ سورہ احزاب کی آیت ۵۰ میں عورتوں کی چند اصناف (جن سے حضورؐ کا نکاح حلال تھا) کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ (الاحزاب-۵۲)	ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال نہیں ہیں

یعنی مذکورہ اصناف کی خواتین کے علاوہ دوسری تمام عورتیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام کردی گئی تھیں۔

۳۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن وہ قانوناً ان سب کو یا ان میں سے بعض کو طلاق دے کر ان کی جگہ دوسری عورتوں سے نکاح کرسکتا ہے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (الاحزاب: ۵۲)	اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ان پابندیوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ازواج کے معاملے میں آپ کو چار کی قید سے آزاد رکھا گیا تھا لیکن آپ پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ ایسی تھیں کہ نکاح اور طلاق دونوں معاملات میں آپ مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پابند تھے۔

ازواجِ مطہرات کو دوسرے نکاح کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟

اس سلسلے میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

[1] جامع ترمذی۔ ابواب التفسیر، سورۂ احزاب، تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۹۹

کے بعد ازواجِ مطہرات کو دوسرا نکاح کرنے کا حق کیوں نہیں دیا گیا؟ اسلام میں غیر شادی شدہ (کنواری) مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے نکاح پر زور دیا گیا ہے پھر حضور کی بیواؤں سے یہ حق کیوں سلب کرلیا گیا؟

یہ اعتراض دین کی حقیقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کی حیثیت اور مقام و مرتبہ سے ناواقفیت کے نتیجے میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تھوڑی سی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت کی حیثیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امّت کو راہِ حق دکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپ ان کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے اور ان کے لیے ماں باپ سے بڑھ کر شفیق و رحیم تھے۔ اس لیے آپ کا حق بھی مسلمانوں پر دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے۔ ان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ آپؐ کو اپنے ماں باپ، اولاد، رشتہ داروں اور تمام انسانوں سے زیادہ عزیز رکھیں اور ان کے دلوں میں آپ کی محبت دنیا کی ہر شئے سے بڑھ کر ہو۔ اسی مضمون کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے:

لایؤمن احدکم حتی	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک
اکونَ احبّ الیہ من	مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس
والدہ وولدہ والناس	کے نزدیک اس کے ماں باپ، اولاد اور
اجمعین [1]	تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ان پر لازم ہے کہ آپ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں اور آپ کے کسی حکم اور فیصلہ کے سامنے ان کے لیے کسی چوں و چرا کی گنجائش نہ ہو۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت
اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا	کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا
اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ	رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان۔ باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان

اَمْرِهِمْ	اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے
(الاحزاب۔ ۳۶)	کا اختیار حاصل رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس غایت درجہ محبت اور انتہائی عظمت کا فطری تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں آپؐ کی ازواجِ مطہرات کے لیے بھی ویسے ہی جذبات ہوں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی بنا پر ان کے لیے ویسا ہی احترام، عظمت اور عقیدت ہو جیسا شریف بیٹوں کا اپنی ماؤں کے لیے ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ہونا چاہیے۔ اس حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ	بلا شبہ نبی تو اہلِ ایمان کے لیے ان
مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ	کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں
(الاحزاب۔ ۶)	ان کی مائیں ہیں۔

ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں اس درجہ احترام اور عقیدت ہوتے ہوئے کوئی مسلمان ان سے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس تصور کو وہ اپنی ماں سے نکاح کے تصور سے زیادہ شرم انگیز محسوس کرے گا۔ اسی فطری تقاضے کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کی حرمت کی صراحت کر دی گئی ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ	تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ
تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا	کے رسولؐ کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے
اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (الاحزاب۔۵۳)	کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔

ازواجِ نبی امّت کی معلّمات ہیں

اس پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ازواجِ مطہرات پر دین کے معاملے میں دوہری ذمہ داری عائد تھی۔ ایک طرف تو ان پر لازم تھا کہ وہ دنیا کی چند روزہ زندگی پر فریفتہ ہونے کے بجائے آخرت کی ابدی زندگی کو ترجیح دیں، اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی طالب ہوں، ان کی اطاعت کریں اور نیک عمل کریں۔ دوسری طرف ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی گئی تھی کہ ان کے گھروں میں اللہ کی جو آیات سنائی جاتی ہیں

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حکمت کی جو باتیں ارشاد فرماتے ہیں انھیں دوسروں تک پہنچائیں، آپؐ کی اندرونِ خانہ زندگی کا ایک ایک پہلو محفوظ رکھیں اور اس سے دوسروں کو باخبر کریں۔ سورۂ احزاب میں ازواجِ مطہرات کی ان دونوں ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری ذمہ داری کے تعلق سے فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ
اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔

(الاحزاب: ۳۴)

ازواجِ مطہرات نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا۔ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اپنی زندگیاں دین کی تعلیم وتبلیغ کے لیے وقف کردیں۔ وہ جہاں بھی رہیں لوگوں کو فیض پہنچاتی رہیں۔ بہت سے مسائل جن کا حل بتانے سے فقہائے صحابہ بھی قاصر رہتے تھے، ازواجِ مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق رکھنے کی وجہ سے بآسانی انھیں حل کردیتی تھیں۔ ان کا یہ فیض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد طویل عرصہ تک جاری رہا۔ اس کا اندازہ درج ذیل جدول سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

جدول ۲

نمبر شمار	نام ام المومنین	حضورؐ سے نکاح کا زمانہ	مدتِ رفاقت	سنہ وفات	حضورؐ کی وفات کے بعد کتنے سال زندہ رہیں؟
۱۔	حضرت سودہؓ	سنہ۱۰ بعثت	۱۴ سال	سنہ۲۳ھ[۱]	۱۲ سال
۲۔	حضرت عائشہؓ	سنہ۱۰ بعثت (رخصتی شوال سنہ۱ھ)	۹ سال	سنہ۵۷ھ	۴۶ سال
۳۔	حضرت حفصہؓ	سنہ۳ھ	۸ سال	سنہ۴۵ھ	۳۴ سال
۴۔	حضرت ام سلمہؓ	سنہ۴ھ	۷ سال	سنہ۶۱ھ	۵۰ سال
۵۔	حضرت زینب بنت جحشؓ	سنہ۵ھ	۶ سال	سنہ۲۰ھ	۹ سال
۶۔	حضرت جویریہؓ	سنہ۵ھ	۶ سال	سنہ۵۳ھ	۴۲ سال

[۱] حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ سوانح نگاروں نے مختلف سنین مثلاً سنہ۱۹ھ، سنہ۲۳ھ، سنہ۵۴ھ، سنہ۵۵ھ بیان کیے ہیں۔

۷۔ حضرت ام حبیبہؓ	سنہ ۶ھ	۵ سال	سنہ ۴۴ھ [1]	۴۸ سال
۸۔ حضرت صفیہؓ	سنہ ۷ھ	۳ ۳/۴ سال	سنہ ۵۰ھ	۳۹ سال
۹۔ حضرت میمونہؓ	سنہ ۷ھ	۳ ۱/۴ سال	سنہ ۵۱ھ	۴۰ سال

اس طویل عرصہ میں صحابہ اور تابعین نے بہت بڑی تعداد میں ازواجِ مطہرات سے کسبِ فیض کیا اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے تھے اور جو شخص بھی چاہتا بلا روک ٹوک ان سے استفادہ کرسکتا تھا۔ اس منصب کا تقاضا تھا کہ انھیں ماؤں ہی کے درجے میں رکھا جائے اور انھیں یہی حیثیت دی جائے۔ کیونکہ اسی حیثیت میں وہ اس فریضۂ منصبی کو زیادہ اچھی طرح ادا کرسکتی تھیں۔ اگر انھیں اس درجہ سے گرا دیا جاتا اور کوئی اور حیثیت دے دی جاتی تو وہ اپنے وقار کو قائم نہیں رکھ سکتی تھیں اور دوسرے بھی ان سے اس طرح استفادہ نہ کرپاتے جس طرح معلّماتِ امت سے کرنا چاہیے۔

آزاد بیویوں کی موجودگی میں باندیاں کیوں رکھیں؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد بیویوں کے رہتے ہوئے باندیوں کو اپنے مِلکِ یمین میں کیوں رکھا؟ اس اعتراض کا محرّک یہ ہے کہ باندیوں کو سماج میں آزاد عورتوں کے مقابلے میں کم تر حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے آزاد بیویوں کے رہتے ہوئے ان سے تمتّع کرنے کا مقصد بڑھی ہوئی جنسی خواہش کی تسکین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ گزشتہ صفحات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ اس کی قطعی تردید کے لیے کافی ہے۔

اسلام نے غلامی کے رواج کو سخت ناپسند کیا ہے لیکن اس کے یکلخت خاتمہ کے بجائے اس نے دیگر احکام کی طرح اس میں بھی تدریج ملحوظ رکھی ہے۔ اسلام نے غلاموں کو عام انسانی حقوق عطا کیے ہیں۔ غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی

---

[1] حضرت ام حبیبہؓ کا سنہ وفات باختلاف روایات سنہ ۴۴ھ، سنہ ۵۰ھ، سنہ ۵۵ھ، سنہ ۵۹ھ ہے۔

ہے بلکہ بہت سی صورتوں میں اس کو واجب قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر غلامی کا وجود برداشت کیا ہے۔ اس زمانے میں ہونے والی جنگوں میں جو مرد اور عورتیں گرفتار کی جاتی تھیں انھیں غلام اور باندیاں بنالیا جاتا تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عرف کو باقی رکھا۔ اس زمانے میں مسلمان ایسے ہنگامی حالات سے گزر رہے تھے کہ ان کے پاس ایسے قید خانے نہیں تھے جہاں جنگی قیدیوں کو رکھا جاسکے اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سرکاری انتظام کیا جاسکے۔ اس لیے مناسب خیال کیا گیا کہ قیدی مردوں اور عورتوں کو فوجیوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان کے بنیادی حقوق کی نگہداشت کرنے اور ان کا پورا خیال رکھنے کی تاکید کردی جائے۔

بعض جنگوں میں قید ہوکر آنے والی بعض خواتین سردارانِ قبائل کے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے مقام و مرتبہ کا خیال کرکے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازخود یا بعض صحابہ کے مشورے سے انھیں اپنے لیے خاص کرلیا۔ ایسا کرنے سے ان قبائل کی عداوتیں ختم ہوگئیں اور وہ پھر کبھی مقابلہ پر نہیں آئے۔ غزوۂ بنو مصطلق (۵ھ) کے قیدیوں میں سردارِ قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی بیٹی برّہ (جویریہؓ) بھی تھیں۔ مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو وہ حضرت ثابت بن قیسؓ یا ان کے چچا زاد بھائی کے حصے میں آئیں۔ برّہ نے ان سے یہ معاملہ طے کرلیا کہ وہ کچھ مال لے کر انھیں آزاد کردیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ اتنا مال فراہم کرکے انھیں آزاد کروادیں۔ آپؐ نے مطلوبہ رقم اپنی طرف سے ادا کردی اور انھیں ان کی مرضی سے اپنی زوجیت میں لے لیا[1]۔ اسی طرح غزوۂ خیبر (۷ھ) کے اسیران میں یہودی قبیلہ بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی زینب (صفیہؓ) تھیں۔ مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کی تقسیم کے وقت وہ حضرت دحیہ کلبیؓ کے حصے میں آئیں۔ بعض صحابہ نے متوجہ کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ بنو نضیر کے ایک معزز سردار کی بیٹی ہیں، یہ صرف آپ کے لیے موزوں ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت دحیہؓ کو ایک دوسری

---

[1] سیرۃ النبی۔ ابن ہشام، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ قاہرہ ۱۹۳۷ ۳۳۹/۳
۱۸۳

باندی دے کر صفیہؓ کو واپس لے لیا اور انھیں آزاد کر کے اپنی زوجیت کا شرف بخشا۔[۱]

ایسا ہی معاملہ حضرت ریحانہ بنتِ شمعونؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بنو قریظہ کے سردار شمعون بن زید کی بیٹی تھیں۔ اس قبیلہ کی بدعہدی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کے خلاف فوج کشی کی اور اسے شکست دے کر مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اسیرانِ جنگ میں حضرت ریحانہ بھی تھیں۔ انھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا اور آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ سردارِ قبیلہ کی بیٹی ہیں۔ آپؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا مگر انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا انکار پسند نہیں آیا۔ لیکن جلد ہی آپ کو ان کے اسلام قبول کر لینے کی اطلاع ملی جس سے آپ کو خوشی ہوئی۔ آپؐ نے ان کے سامنے پیش کش کی کہ اگر ان کی مرضی ہو تو آپ ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیں۔ انھوں نے جواب دیا: "اے اللہ کے رسول مجھے اپنی مملوکہ ہی رہنے دیں۔ یہ میرے لیے آسان ہے اور آپ کو بھی اس میں سہولت ہوگی۔" چنانچہ آپؐ نے انھیں اسی حال میں رہنے دیا۔[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری باندی حضرت ماریہؓ تھیں۔ صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ملکوں کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط روانہ کیے تو مصر کے عیسائی حکمراں مقوقس کے پاس حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو خط دے کر بھیجا تھا۔ مقوقس نے آپؐ کے سفیر اور مکتوب کے ساتھ عزت واحترام کا برتاؤ کیا۔ اپنے جوابی خط کے ساتھ اس نے کچھ تحائف بھیجے جن میں دو لڑکیاں (ماریہ اور سیرین) بھی تھیں۔ اس نے اپنے خط میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ مصر میں ان لڑکیوں کو بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (وبعثت الیک بجاریتین لہما مکان فی القبط عظیم)[۳] گویا یہ شاہی کنیزیں تھیں جنھیں مقوقس نے خاص طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ سیرت ابن ہشام ۳/۳۸۱، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ابن اثیر الجزری، دار الشعب قاہرہ ۷/۱۶۹

۲؎ سیرت ابن ہشام ۳/۲۶۴-۲۶۵، الطبقات الکبریٰ لابن سعد، دار صادر بیروت ۱۹۵۸ء ۸/۱۳۱۔

ابن سعد نے بعض روایتیں ایسی نقل کی ہیں جن میں صراحت ہے کہ حضورؐ نے حضرت ریحانہ کو آزاد کر کے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا تھا۔ لیکن اکثر اصحابِ سیر نے انھیں مملوکہ قرار دیا ہے۔

۳؎ طبقات ابن سعد ۱/۲۶۰، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، د۔ محمد حمید اللہ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر قاہرہ ۱۹۴۱ء

کی خدمت میں بھیجا تھا۔ یہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ چونکہ اسلام میں دو سگی بہنیں ایک شخص کے پاس نہیں رہ سکتی تھیں اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہؓ کو اپنے پاس رکھا اور سیرینؓ کو حضرت حسان بن ثابتؓ کو دے دیا۔

حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی شادی پر اعتراضات

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی کم سنی کی شادی بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سے حضرات اعتراض کرتے ہیں۔ جس زمانہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا اس وقت آپؐ کی عمر پچاس سال اور حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی۔ تین سال کے بعد ان کی رخصتی ہوئی تو اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ معترضین کہتے ہیں کہ زوجین کی عمروں میں اتنا تفاوت نامناسب ہے۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنی کم سن لڑکی اس قابل نہیں ہوتی کہ اس سے جنسی تعلق قائم کیا جائے[1] حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نو سال گزارے۔ اس طرح اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں اور اپنی عمر کے تقریباً ۴۶ سال بیوگی کی حالت میں گزارے۔ بعض لوگ یہ بھی اعتراض اٹھاتے ہیں کہ کسی ایسی لڑکی کو جو اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی ہو آئندہ کسی سے نکاح کرنے کے حق سے محروم کر دینا اس پر ظلم عظیم ہے۔

زوجین میں اصل باہمی موافقت ہے

زوجین کے درمیان عمروں میں زیادہ تفاوت کو اس لیے نامناسب خیال

---

[1] شاید ایسے ہی اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح سولہ سال کی عمر میں اور رخصتی انیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے انھوں نے لکھا ہے: "حضرت عائشہؓ نکاح کے وقت چھ برس کی اور رخصتی کے وقت نو برس کی تھیں اسلام کے پورے تاریخی سرمایہ میں ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔" اس موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ ان کی کتاب "سیرت عائشہؓ" کے پاکستانی ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ شائع کردہ مکتبہ اردو بازار لاہور ۳۱۳ — ۳۶۶

کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ چیز عموماً ان کے مابین خوش گوار ازدواجی تعلقات اور مزاجوں میں موافقت و ہم آہنگی میں حارج ہوتی ہے۔ لیکن خوش گوار معاشرت کے لیے ہم سنی ضروری نہیں ہے۔ ہندو مت کی کتابوں سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے منوسمرتی میں ہے۔

"تیس[۳۰] برس کی عمر کا لڑکا اور بارہ[۱۲] برس کی دختر کا وواہ کرے یا چوبیس[۲۴] برس کا لڑکا اور آٹھ برس کی لڑکی کا وواہ کرے"[۱]

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ازدواجی تعلقات حضرت عائشہؓ کے ساتھ انتہائی خوش گوار اور مثالی تھے۔ دونوں کے درمیان غایت درجہ محبت پائی جاتی تھی۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود نو سالہ رفاقت میں ان کے درمیان ناموافقت اور بے اطمینانی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ حضرت عائشہؓ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی بیوی تھیں دوسروں کو بھی اس کا احساس تھا۔ اس معاملے میں آپ تک شکایت پہنچائی گئی تو آپؐ نے فرمایا: "لاتوذینی فی عائشۃ" (عائشہ کے معاملے میں مجھے دق نہ کرو)[۲] احادیث میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں کہ کس کس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دل جوئی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو بھی حضور سے بہت محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبت کے مقابلے میں کسی دوسرے کی محبت کو گوارا نہیں کر سکتی تھیں[۳]۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اگرچہ زوجین کا ہم سن ہونا پسندیدہ ہے[۴] لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ اس کے بجائے زوجین کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ عہدِ صحابہ میں اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ لوگ بعض اسباب سے عمروں کا فرق نظر انداز کرتے ہوئے کم سن لڑکیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ مثلاً حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت علیؓ کی صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ سے ۱۷ھ میں

---

[۱] منوسمرتی باب ۹ اشلوک ۹۴ بحوالہ مقدس رسول، ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری طبع دہلی ۱۹۶۰ء طبع سوم ص ۷۹

[۲] سنن نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب الرجل بعض نسائہ اکثر من بعض

[۳] اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے سیرتِ عائشہ، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی منزل اعظم گڑھ، طبع دہم ۱۹۹۶ء

[۴] اس موضوع پر ملاحظہ کیجیے مولانا سلطان احمد اصلاحی کا رسالہ کم سنی کی شادی اور اسلام شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

نکاح کیا۔ اس وقت حضرت ام کلثومؓ کی عمر نو دس سال اور فاروق اعظمؓ کی عمر پچپن سال سے زائد تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب دیا "انہا صغیرۃ" (وہ تو ابھی کم سن ہے) لیکن جب حضرت عمرؓ نے واضح کیا کہ ان کا مقصد خاندانِ نبوت سے انتساب کا شرف حاصل کرنا ہے تو حضرت علیؓ تیار ہو گئے، ان سے حضرت عمرؓ کی دو اولادیں ہوئیں[1]

حضرت عائشہؓ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا مقصد جہاں ایک طرف اپنے قریبی رفیق اور جاں نثار حضرت ابوبکرؓ سے تعلقات کو مزید استحکام بخشنا تھا وہیں حضرت عائشہؓ کی ذاتی خصوصیات اور فطری صلاحیتیں بھی انھیں اس شرف کا مستحق ٹھہراتی تھیں۔

بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی

یہ صحیح ہے کہ کم سن لڑکی کا نکاح اس وقت کرنا پسندیدہ ہے جب وہ اس قابل ہو جائے کہ اس سے مخصوص ازدواجی تعلق قائم کیا جا سکے۔ اس کا لحاظ نہ کرنے میں بہت سے نقصانات ہیں جن کا کم سن لڑکی اور مرد دونوں شکار ہوتے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بلوغ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ جسمانی نشو ونما، غذائیت، ذہنی پرورش، خاندان، آب وہوا اور دیگر عوامل ہیں جو بلوغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے کوئی لڑکی جلدی بالغ ہو جاتی ہے اور کوئی دیر میں۔ اس لیے بلوغ کی ایک عمر متعین کر کے اس سے کم عمر کی ہر لڑکی کو نابالغ سمجھ لینا صحیح نہیں۔

طبی تحقیقات اور آئے دن اخبارات کی زینت بننے والے واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چند ماہ قبل ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق برطانیہ کی ایک بارہ سالہ لڑکی کو "سب سے کم عمر ماں" (YOUNGEST MOTHER) اور ایک چوبیس سالہ خاتون کو "سب سے کم عمر دادی" (YOUNGEST GRAND MOTHER)

---

[1] اسد الغابہ: ۳۸۷/۷، مزید ملاحظہ کیجیے طبقات ابن سعد ۸/۴۶۳-۴۶۴ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ابن عبد البر، مکتبۃ نہضۃ مصر ومطبعتہا۔ الفجالۃ مصر ۴/۱۹۵۴-۱۹۵۶

کا خطاب مل چکا ہے۔

۱۹۹۰ء میں مغربی ترکی کے ایک قصبہ افیون میں ایک نو سالہ لڑکی نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعہ اس بچے کی ولادت کرائی تاکہ دورانِ ولادت زچہ اور بچہ دونوں کی جانوں کو کوئی خطرہ نہ رہے[1]۔ ایک دوسری خبر کے مطابق ۱۹۹۳ء میں شمالی میکسیکو کی ایک آٹھ سالہ لڑکی نے نیشنل میڈیکل سینٹر آف ویسٹ ہاسپٹل گوداالاجار (GUADALAJARA) میں ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ اس کا وزن ۲٫۳ کلو تھا اور اس کی ولادت معمول کے نو ماہ کے حمل کے بعد ہوئی تھی[2]۔

عرب کی آب وہوا گرم ہے۔ وہاں کی عمرِ بلوغ کو سرد آب وہوا والے ممالک میں لڑکیوں کی عمرِ بلوغ پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ ویسے بھی حضرت عائشہؓ کے سلسلے میں روایات میں آتا ہے کہ بچپن میں ان کی نشوونما بہت اچھی تھی اور وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی لگتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کا ایک قول ہے:

اذا ابلغت الجاریۃ تسع سنین فھی امرأۃ[3] — لڑکی نو سال کی ہو جائے تو وہ عورت ہو جاتی ہے۔

اس بیان کو اگر عرب میں عمرِ بلوغ کی حد کے طور پر نہ قبول کیا جائے تو کم از کم اسے حضرت عائشہؓ کی اپنی ذات کے بارے میں ضرور تسلیم کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہؓ کی ذات سے امت کو حاصل ہونے والے فائدے

حضرت عائشہؓ اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور بقیہ عمر انھوں نے اسی حالت میں گزار دی۔ بظاہر یہ بڑا ظلم معلوم ہوتا ہے کہ ایک لڑکی جو عین عالمِ شباب میں بیوہ ہو گئی ہو اسے دوبارہ نکاح کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ لیکن وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ شبہ نہیں رہتا۔

---

[1] ملاحظہ کیجیے انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نئی دہلی اور روزنامہ قومی آواز نئی دہلی ۱۵ مارچ ۱۹۹۰ء

[2] روزنامہ ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی اور روزنامہ قومی آواز نئی دہلی ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ء (مذکورہ دونوں حوالوں کی فراہمی کے لیے راقم سطور محترم مولانا سلطان احمد اصلاحی کا شکر گزار ہے)

[3] جامع ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی اکراہ الیتیمۃ علی التزویج۔

اوپر گزر چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کو دوسرے نکاح کا حق نہ دینے کی کیا حکمت تھی۔ حضرت عائشہؓ نے دین کی تعلیم واشاعت کی جو غیر معمولی خدمت انجام دی ہے وہ پوری امتِ مسلمہ پر ان کا عظیم احسان ہے۔ ان میں ذہانت و فطانت کے آثار بچپن سے نمایاں تھے۔ انھوں نے اسلام اور رسول اللہؐ کے جاں نثار اور علم انساب وشعر کے ماہر باپ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ کم سنی ہی میں کاشانۂ نبوت میں پہنچ جانے کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی فیضانِ صحبت نے ان کی فطری صلاحیتوں میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ان کا حجرہ مسجد نبوی سے متصل ہونے کی وجہ سے روزانہ مسجد میں منعقد ہونے والی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وارشاد کی مجلسوں سے بھی استفادہ کرتی تھیں اور خود بھی جس مسئلہ میں ذرا سا اشکال محسوس کرتیں بلا تأمل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیا کرتی تھیں۔ آپؐ خود بھی ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کی نگرانی فرماتے تھے اور جہاں کوئی بات شریعت سے غیر ہم آہنگ پاتے، تنبیہ فرما دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتاب و سنت کے علم اور احکامِ الٰہی کی معرفت میں جماعتِ صحابہ وصحابیات میں ممتاز نظر آتی ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھیں مرجعیت کا مقام حاصل تھا۔ صحابہ وصحابیات اور دیگر مسلمان مرد اور خواتین اپنے مختلف مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تعلیم وارشاد کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور تشنگانِ علم دور دراز سے آکر ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے۔ محرم (جن سے پردہ نہ تھا) گھر کے اندر بیٹھ کر روبرو اور نامحرم مسجد نبوی میں بیٹھ کر پردہ کی اوٹ سے ان سے استفادہ کرتے تھے۔ تعلیم دین کا یہ سلسلہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی تک جاری رہا۔ اس طرح حضرت عائشہؓ کی ذات سے امت کو جو عظیم فائدہ پہنچا اس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عائشہؓ کو دوسرے نکاح کی اجازت نہ دے کر ان کی حق تلفی کی گئی تو امت کے اجتماعی مفاد کو دیکھتے ہوئے ایسی حق تلفی کو گوارا کیا جاسکتا ہے اور گوارا کیا گیا۔ کسی مشن کا استحکام، عروج اور توسیع اس سے وابستہ افراد سے قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کی راہ میں کسی ایک فرد کی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

نکاحِ زینبؓ کا واقعہ

حیاتِ طیبہ میں امّ المومنین حضرت زینب بنتِ جحشؓ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے کر دیا تھا لیکن نباہ نہ ہوسکا اور حضرت زیدؓ نے انھیں طلاق دے دی تو ان سے حضور نے خود نکاح کر لیا۔

اس سیدھے سادے واقعہ میں مخالفینِ اسلام نے خوب خوب رنگ آمیزی کی ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت کو داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ سطورِ ذیل میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جارہی ہے تاکہ حقیقت واضح ہوسکے۔

حضرت زیدؓ کون تھے؟

حضرت زیدؓ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ بچپن میں ایک مرتبہ ان کے قبیلہ کے پڑاؤ پر دشمنوں نے حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن لوگوں کو غلام بنا کر لے گئے ان میں زید بھی تھے۔ پھر انھوں نے انھیں عکاظ کے بازار میں بیچ دیا۔ حکیم بن حزام نے انھیں خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کو ہبہ کر دیا۔ پھر جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تو انھوں نے زید کو آپؐ کی نذر کر دیا۔ اس وقت حضرت زید کی عمر آٹھ سال تھی۔ حضور کے یہاں انھیں ایسی محبت ملی کہ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور بعد میں ایک موقع پر جب ان کے باپ اور چچا انھیں ڈھونڈتے ہوئے آپہنچے اور حضور کی اجازت سے انھیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو انھوں نے انکار کر دیا اور آزادی پر حضور کی غلامی کو ترجیح دی۔ یہ دیکھ کر حضور نے انھیں آزاد کر دیا اور انھیں اپنا متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا) بنا لیا۔ یہ بعثت سے پہلے کا واقعہ ہے[1]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے دعوئ نبوت سنتے ہی جن چار ہستیوں

---

[1] اسد الغابۃ ۲/۲۸۱

نے بغیر کسی ادنیٰ شک وتردّد کے فوراً اسے تسلیم کرلیا تھا، حضرت زیدؓ ان میں سے ایک تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منظورِ نظر اور معتمدِ خاص تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد جب آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی تھی اس موقع پر آپؐ نے استثنائی صورت میں حضرت زیدؓ اور اپنے محبوب چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ (دونوں مہاجر) کو بھائی بھائی قرار دیا تھا۔[1] غزوۂ بدر سے قبل غزوۂ سفوان (غزوۂ بدرالاولیٰ) میں آں حضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے تو ان ہی کو مدینہ کا عامل بنایا تھا۔[2] غزوہ بدر میں جب اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے مسلمانوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی تو اہلِ مدینہ کو اس کی خوشخبری دینے کے لیے آں حضرتؐ نے انہی کو بھیجا تھا۔[3] غزوۂ بدر کے بعد آں حضرتؐ نے اپنی صاحب زادی حضرت زینبؓ کو مکہ سے لانے کے لیے حضرت زیدؓ ہی کو مامور کیا تھا۔[4] متعدد مواقع پر آپؐ نے ان کی سربراہی میں سرایا روانہ کیے تھے۔[5] بلکہ حضرت عائشہؓ تو یہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو جس سریہ میں بھی بھیجا اس کی سربراہی انہی کے حوالے کی۔[6] آں حضرتؐ نے ان کا نکاح اپنی دایا حضرت ام ایمنؓ سے کردیا تھا، ان سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے تھے۔[7]

حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح اور علیحدگی

حضرت زیدؓ کی عزت افزائی کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان کا نکاح حضرت زینبؓ سے کردیں۔ حضرت زینبؓ کے عزیزوں کو یہ رشتہ پسند نہ تھا لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصرار کیا تو تیار ہوگئے اور نکاح ہوگیا۔ آں حضرتؐ نے حضرت زیدؓ کی طرف سے مہر ادا کیا اور گھر بسانے کے لیے ضروری سازوسامان بھی فراہم کیا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ۱۲۴/۲
[2] حوالہ سابق ۲۳۸/۲
[3] حوالہ سابق ۲۸۵/۲
[4] حوالہ سابق ۲۹۷/۲
[5] حوالہ سابق ۲۲۹/۲، ۲۸۴/۴، ۲۸۵، ۲۹۰، ۳۱۲
[6] اسد الغابہ ۲۸۳/۲
[7] حوالہ سابق

حضرت زینبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اس رشتہ کو منظور تو کرلیا تھا لیکن حسب ونسب میں اپنی برتری کے احساس کو وہ اپنے دل سے کسی طرح نہ مٹا سکی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ منافقین کے برپا کردہ فتنہ انگیز ماحول میں ان کے اس احساس میں اضافہ ہوا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوجین کے درمیان خوش گوار معاشرت قائم نہ رہ سکی۔ اور کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک حضرت زیدؓ نے ارادہ کرلیا کہ طلاق دے کر اس قضیہ کا خاتمہ کردیں۔ چونکہ یہ نکاح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ اور ایما رسے ہوا تھا اس لیے انھوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو ان کے اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے یہ نکاح ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے کروایا تھا اس لیے آپ کی خواہش تھی کہ وہ قائم رہے۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو اللہ کا خوف دلاتے ہوئے ارادۂ طلاق سے روکنے کی کوشش کی (الاحزاب: ۳۷) یہ آپؐ کا حکم نہیں بلکہ ناصحانہ مشورہ تھا جسے قبول کرنے یا نہ کرنے میں وہ آزاد تھے۔ حالات کے دباؤ کی بنا پر وہ خود کو اس پر آمادہ نہ کرسکے اور انھوں نے طلاق دے دی۔

حضورؐ کا حضرت زینبؓ سے نکاح

حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینبؓ کی دل جوئی کی صورت یہ رہ گئی تھی کہ آپ خود ان سے نکاح کرلیں۔ لیکن آپ کو اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے سے مخالفین کو فتنہ برپا کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ آپ کے لیے یہ امر بھی پریشانی کا باعث تھا کہ عام مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کا حکم نازل ہوچکا تھا اور اس وقت آپ کے نکاح میں بھی چار ازواج تھیں (اس وقت تک اس حکم سے آپ کو مستثنیٰ کرنے والی آیت نازل نہیں ہوئی تھی) ان وجوہ سے آپؐ حضرت زینبؓ سے نکاح کے سلسلے میں متردد تھے۔ سورۂ احزاب کی آیت: ۳۷ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالاں کہ اللہ اس کا زیادہ

حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بالآخر وحیِ الٰہی نے آپ کا یہ تردد ختم کر دیا اور صاف الفاظ میں حکم دے دیا گیا کہ لوگوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر آپ یہ نکاح کریں۔

مخالفین کا فتنہ

اس واقعہ پر عہدِ نبوی میں بھی مخالفینِ اسلام نے فتنہ پھیلانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بھی اس کو بنیاد بنا کر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ حضرت زینبؓ سے حضرت زیدؓ کے نکاح پر عہدِ نبوی میں منافقوں اور دوسرے اسلام دشمنوں نے یہ فتنہ برپا کیا کہ ایک آزاد کردہ غلام جو سماجی اعتبار سے فروتر حیثیت کا مالک ہوتا ہے، اس کا نکاح ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی اور حسب و نسب کے لحاظ سے برتر حیثیت کی مالک خاتون سے کر کے اس (خاتون) کے وقار اور عزتِ نفس کو پامال کر دیا گیا ہے۔ پھر جب حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینبؓ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کر لیا تو ان بدباطنوں نے اس کو بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف شر انگیزی کا ذریعہ بنایا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہؓ کے ساتھ نکاح کر لیا ہے، جو عرب سماج کی معروف روایت کے خلاف ہے۔ حالانکہ دونوں موقعوں پر حضرت زینبؓ کے نکاح سے اسلام کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا اظہار ہوا۔

رسول اللہؐ نے جاہلیت کی غلط رسوم کو ختم کیا

اسلام میں عہدِ جاہلیت کی بعض رسوم اور اقدار کو باقی بھی رکھا گیا ہے لیکن اس عہد کے جو تصورات و افکار اور رسوم و اقدار اسلام کے بنیادی احکام اور تعلیمات سے ٹکراتے تھے ان کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔ نکاحِ زینبؓ کے ذریعہ بھی بعض جاہلی تصورات اور رسوم کی اصلاح کی گئی۔

عرب معاشرہ میں غلاموں اور موالی (آزاد کردہ غلاموں) کو سماجی حیثیت سے پست مقام حاصل تھا۔ اسلام نے انسانوں اور انسانوں کے درمیان سارے امتیازات

باطل قرار دیے اور اعلان کر دیا کہ تمام انسان ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے سب برابر ہیں اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو (الحجرات ۔۱۳) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برسرِ عام اعلان فرمایا کہ "عربی، عجمی، کالے، گورے، کسی شخص کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر"[۱]۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غلاموں کے بارے میں لوگوں کے اس تصور میں تبدیلی آئے۔ اسی لیے آپؐ نے باصرار حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا نکاح کروایا تھا۔

اسی طرح عہدِ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کو صلبی بیٹے کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ میراث میں اس کا حصہ لگایا جاتا تھا اور دیگر سماجی معاملات میں بھی اس کے ساتھ صلبی بیٹے جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کا منہ بولا بیٹا اگر وفات پا جائے یا طلاق دے دے تو اس کی (سابقہ) بیوی سے وہ نکاح کرسکے۔ اسلام کی نظر میں یہ ایک غلط جاہلی رسم تھی کیونکہ یہ فطری عائلی نظام کے برعکس تھی۔ منہ بولے بیٹے صلبی بیٹوں کے مثل نہیں ہوسکتے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ — اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ (الاحزاب: ۴)

حضرت زیدؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ جب انھوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو اس غلط جاہلی رسم کی اصلاح کا ایک موقع ہاتھ آگیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت کی کہ لوگوں کے اعتراضات اور شر انگیزیوں کی پروا کیے بغیر حضرت زینبؓ سے نکاح کریں تاکہ آپ کے عمل کے ذریعہ اس غلط رسم کی اصلاح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا — پھر جب زید اس سے اپنی حاجت
زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى — پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون)
الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ — کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے

---

[۱] مسند احمد ۵/ ۴۱۱

اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (الاحزاب: ۳۷)	منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔

ایک اور اعتراض

بعض لوگوں نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ایک افسانہ یہ تراشا ہے کہ نعوذ باللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہو کو دیکھ کر اسے دل دے بیٹھے تھے اور اس پر ریجھ گئے تھے۔ سعادت مند بیٹے کو کسی طرح اس تعلقِ خاطر کا علم ہو گیا تو اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد باپ نے بہو سے شادی رچا لی۔

اس اعتراض کی غیر معقولیت

یہ کہنا بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ حضرت زینبؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی صاحب زادی تھیں۔ بعثت سے سترہ سال قبل ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ان کا بچپن اور جوانی سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنے بھائی عبد اللہ بن جحشؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تھی[1]۔ اگر حضورؐ کے دل میں واقعی حضرت زینبؓ کی طرف میلان ہوتا تو حضرت زیدؓ کے لیے نکاح کا پیغام دینے پھر باصرار اس رشتے کو طے کرانے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کے بجائے آپ شروع ہی میں ان سے نکاح کر سکتے تھے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو ان کے گھر والے بخوشی تیار ہو جاتے اور اسے اپنی سعادت سمجھتے۔

خلاصۂ کلام

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی کے دیگر پہلوؤں کی طرح اس کا ازدواجی پہلو بھی تابناک اور مثالی ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر ذاتِ نبوی پر نفسانیت کا الزام لگانا سراسر تعصب اور جہالت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ دین کے استحکام میں مدد لی گئی اور اس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے انھیں واسطہ بنایا گیا۔ رضی اللہ عنھن و رضین عنہ

---

[1] اسد الغابۃ ۱۲۵/۷۔ سیرت ابن ہشام ۸۱/۲

سیر و سوانح

شیخ حسن البنّا
اسلامی بیداری کے سرخیل

پروفیسر مسعود الرحمن خاں ندوی

بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی جماعتوں کے پیشرو دستہ کی رہبری و رہنمائی شیخ حسن البنّا کے مقدر میں لکھی تھی، انھوں نے اس کا حق اپنی جان داؤ پر لگا کر ادا کیا، آخرکار سامراجی طاقت برطانیہ اور اس کی آلۂ کار شاہ فاروق کی حکومت کی ساز باز سے ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء کی شام کو انھیں دھوکہ سے قتل کر دیا گیا۔

ان کی شہادت کے عظیم سانحہ پر پچاس برس گزرنے پر شائع ہونے والا لندن کے ہفتہ وار رسالہ الاخوان کا ایک یادگار کتابچہ الامام الملہم حسن البنّا: عبقریۃ البنّاء (فروری ۱۹۹۹ء، صفحات ۲۸) نظر سے گزرا۔ اس کا بیشتر حصہ شیخ کی اہم تحریروں کے طویل اقتباسات پر مشتمل ہے۔ زیر تحریر مقالہ میں شیخ کے مختصر حالات زندگی، اخوان کی تشکیل، کارکردگی اور شیخ کی حیات میں ابتلاء و آزمائش کے مراحل کے بیان کے ساتھ مذکورہ اقتباسات کے ذریعہ ان کے خیالات و افکار پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق

والد بزرگوار

شیخ کے والد محترم احمد عبدالرحمن البنّا، الساعاتی خوشحال باوقار عالم دین تھے، انھوں نے حفظِ قرآن کریم اور اس کی تجوید کے علاوہ حدیث، فقہ، توحید اور صرف و نحو کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، حدیث میں ان کی دلچسپی بڑھی تو انھوں نے مسند الامام احمد بن حنبل کو الفتح الربانی کے نام سے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور بلوغ الامانی کے عنوان

سے اس کی شرح لکھی۔ علم کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے حصول رزق کا ذریعہ گھڑیوں کی مرمت اختیار کیا، اسی وجہ سے وہ الساعاتی (گھڑی ساز) کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ولادت

حسن البنا کی ولادت مصر کے ایک گاؤں شمشیرہ (ضلع فوہ، مغربی صوبہ) میں اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔

گھریلو تعلیم و تربیت

لکھنے پڑھنے کی عمر تک پہنچتے ہی معمول کے مطابق ان کے والد محترم نے ان کو قرآن شریف حفظ کرایا، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت پیدا کی، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور نحو صرف کی تعلیم کے ساتھ خارجی مطالعہ کا عادی بنایا، ذاتی مکتبہ میں قابلِ لحاظ علمی وادبی اور تاریخی و تہذیبی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، ہر مرحلہ پر اس سے استفادہ کی رہنمائی کی، علم کے ساتھ عمل پر بھی زور دیا جس کی وجہ سے وہ بچپنے ہی سے دینی رنگ میں رنگ گئے، نیز ان کو اپنے پیشہ گھڑی کی مرمت بھی سکھائی تاکہ رزق کے معاملہ میں وہ خود کفیل رہیں۔

عصری تعلیم

گھریلو تعلیم کے ساتھ ان کو مروّجہ عصری تعلیم کے لیے ایک اعدادی مدرسہ میں بھی داخل کیا گیا، جہاں ان کی صلاحیت و ذہانت کے جوہر کھل کر سامنے آئے اور ان کو اساتذہ کی محبت و توجہ خوب حاصل رہی۔ عبادت و مجاہدہ کا فطری رجحان گھر کے دینی ماحول اور تربیت سے مزید نمایاں ہو گیا تھا، اس لیے اس ابتدائی مرحلۂ تعلیم ہی میں برائیوں کی نفرت دل میں بیٹھ چکی تھی، مدرسہ کے اندر اور باہر ان پر برملا نکیر کرتے اور مدرسہ کی دینی و اخلاقی اور علمی و ادبی انجمنوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

۱۹۲۰ء میں ابتدائی مرحلہ کے مدرسین کی تربیت کے مدرستہ المعلمین، دمنہور میں داخل ہوئے، وہاں "حصافی" سلسلۂ تصوف سے ربط و تعلق بڑھا تو اس میں بیعت ہو گئے،

اس سلسلے میں علمی رجحان کے ساتھ اس بات کا اہتمام تھا کہ اختلافی مسائل میں الجھنے سے احتیاط کی جائے اور اپنے نفس کے تزکیہ وتہذیب پر زیادہ توجہ دی جائے۔ بعد میں اس اولین تربیت کا نمایاں اثر خود اخوانی تحریک پر مرتب ہوا، اس کے ارکان کو بتایا جاتا تھا کہ "جہاد کا پہلا میدان تمہارے پہلو میں خود تمہارا نفس ہے، اگر اس پر قابو پالیا تو دیگر میدانوں میں تم زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔" اس لیے ہر اخوانی کا شعار تھا کہ "اپنے نفس کی اصلاح کرو"۔

۱۹۲۳ء میں دارالعلوم میں داخلہ لیا تو والد محترم بھی خاندان کے ساتھ قاہرہ منتقل ہوگئے، وہاں پر حسن البنّا کی صلاحیت پختہ ہوئی، بصیرت بڑھی، انسانی زندگی کی غرض وغایت واضح ہوئی، نیز اس زمانے کے عالمی حالات نے نوجوان عزائم کو جھنجھوڑا اور امت کی خدمت کے لیے نتیجہ خیز کام پر ابھارا۔

۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو عثمانی خلافت کی منسوخی کے عظیم ترین سانحہ نے تمام عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ایک مجنون کے قلم کی دل خراش جنبش سے تاریخ میں پہلی بار خلیفہ اور خلافت کے سایہ سے محروم ہوکر بقول عربی مثل مسلمان کالایتام علی موائد اللئام (اوباشوں کے دسترخوان پر یتیم) کی حیثیت میں آ گئے تھے، پھر اس پر مستزاد بدکرداری، بداخلاقی اور بے حیائی کا سیلاب بلاخیز طغیانی پر تھا، شیخ بنّا اس زمانہ میں قاہرہ کے ماحول سے متعلق لکھتے ہیں:

> قاہرہ میں جو وقت میں نے گذارا، اس دوران عقلی آزادی کے نام پر آراء و افکار اور قلوب ونفوس میں انتشار اور شخصی آزادی کے نام پر اخلاق واعمال میں بگاڑ اور بے لگام بیباکی و بے حیائی عروج پر تھی، یہ الحاد واباحیت کا طاقتور، سرکش اور جڑ سے اکھاڑ کر بہالے جانے والا ایسا سیلاب تھا جس کے سامنے کوئی چیز ٹک سکتی نہ تھی اور حالاتِ زمانہ اس کے لیے سازگار و مددگار تھے۔

لادینی خیالات وافکار کی ترویج واشاعت کے لیے مستشرقین اور عیسائی مبلغین کے شانہ بہ شانہ عرب شعرا اور ادبا کی کھیپ مصر کی زرخیز اسلامی سرزمین سے اسلام اور اس کے بنیادی ڈھانچہ کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے تحریر وتقریر اور ترغیب وتحریص کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر حملہ آور تھی، قاہرہ میں نوجوان

حسن البنّاء کا واسطہ ان غیر معمولی تشویشناک فکر انگیز حالات سے پڑا تو انھوں نے دین وایمان اور اسلامی روایات واقدار کی حفاظت او زبحالی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانے کا عزم مصمم کر لیا۔

ملازمت

۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء سے شیخ حسن البنّا نے اسماعیلیہ کے ابتدائی مدرسہ میں معلّم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور وہاں قیام شروع ہوا، دار المعلمین، دمنہور میں تدریس کی تربیت کے دوران انھوں نے عہد کیا تھا کہ اگر ان کو تعلیم وتدریس کا موقع ملا تو وہ ملازمت کے اوقات کے بعد تعلیم بالغان کا انتظام کریں گے، اب اس وعدہ کو نباہنے کا وقت آیا تو انھوں نے دن میں بچوں کو پڑھانے کے علاوہ رات میں بڑوں کی تعلیم وتربیت اور موعظت ونصیحت کا سلسلہ شروع کیا، لیکن اس شبانہ تعلیمی کام کے لیے مدارس ومساجد کے بجائے بالکل غیر روایتی مقام یعنی عوامی "چائے اور کافی خانے" منتخب کیے جہاں عوامی رابطہ کا زیادہ موقع میسر تھا، اس لیے کہ عرب ممالک اور خصوصًا مصر کے شہروں میں ہر طبقہ کے لوگ شام کے فراغت کے اوقات زیادہ تر ان ہی قہوہ خانوں کے سامنے سڑک کے فضول مناظر دیکھنے میں صرف کرتے ہیں اور اب تک اس کے عادی ہیں۔

یہ انوکھا تجربہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا اور بہت جلد ان کے مخلص ساتھیوں کی خاصی تعداد جمع ہوگئی، ان میں سے انھوں نے اپنے معاونین "انصار" کا انتخاب کیا اور محلہ العراقیہ کے "زاویۃ الحاج مصطفی" میں مغرب تا عشا تربیت شروع کی، وہ ان کو خالص اسلامی عقائد وعبادات کی عملی تعلیم آسان طریقہ سے دیتے اور اختلافی مسائل سے ان کو دور رکھتے، ان کو ہر طبقہ کی زبان میں دلنشیں بات کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا، اس لیے ان کو علماء وصوفیا، جدید تعلیم یافتہ، معاشرہ کے ممتاز افراد اور مختلف انجمنوں اور تنظیموں کے ذمہ داروں کی محبت نصیب ہوئی، خاص کر متوسط اور محنت کش طبقات بڑی تعداد میں ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

اخوان المسلمین کی تشکیل

شیخ بنا کی طرف اس غیر معمولی رجوع عام سے ان کے متوسلین کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا کہ امت کو اس قعر مذلت سے نکالنے کا عملی راستہ کیا ہے؟ آخر کار ذیقعدہ ۱۳۴۷ھ/مارچ ۱۹۲۸ء میں ایک دن ان کے گھر پران کے چھ مخلص ساتھی جمع ہوئے اور اس سلسلہ میں ان سے درخواست کرتے ہوئے اس کام کے لیے ایک معمولی رقم پیش کی اور اس راستہ کی رہنمائی کی ان پر ذمہ داری رکھی، شیخ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسلامی دعوت کے سپاہی بننے کے لیے ان سے بیعت کا مطالبہ کیا، سب نے بیعت کی اور اس بات کی قسم کھائی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان واعتقاد رکھنے والی یہ چھوٹی سی بیشتر جماعت اس کے دین کی دعوت کا کام پوری تندہی سے کرے گی۔ جماعت کا نام رکھنے کی بات آئی تو شیخ نے فرمایا: "ہم اسلام کی خدمت کے رشتہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لیے ہمارا نام الاخوان المسلمون ہونا چاہیے"۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور شیخ ہی کو اس جماعت کا مرشد عام متعین کر دیا۔ تحریک کی رہنمائی کے باقاعدہ سپرد ہونے کے بعد انھوں نے مزید فکر و توجہ سے اس کو اسماعیلیہ اور اس کے اطراف میں پھیلانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔

اخوان کو سامراج مخالف رخ دینے میں اسماعیلیہ کی جائے وقوع کو بھی بڑا دخل تھا۔ یہ غریب علاقہ اُس وقت ایک طرف برطانوی قابض افواج کی دستبرد کا قریب سے تلخ مزہ چکھ رہا تھا تو دوسری طرف نہر سوئز کمپنی اس کے محنت کش طبقہ کا خون چوس رہی تھی، اس لیے ہمہ گیر اسلام کی طرف واپسی کی اخوانی دعوت میں سامراج سے بیزاری اور اس کے خلاف بغاوت کے احساسات بھی شامل ہو گئے اور پھر یہی جذبات سامراجی جوئے سے نجات کا ذریعہ بنے۔

۱۹۳۲ء میں شیخ حسن البنا کا تبادلہ قاہرہ ہوا تو ان کے ساتھ جماعت کا مرکزی دفتر بھی وہاں منتقل ہو گیا، پھر وہیں سے جماعتی تعارف و رہنمائی اور دعوت و تبلیغ کا کام وسیع پیمانہ پر جاری ہوا اور شہری تعلیم یافتہ طبقہ بھی متوجہ ہونے لگا۔ جماعت کی تشکیل کے بعد مسلسل دس سال تک اخوان نے شیخ کی رہنمائی میں پروپیگنڈہ

کے شور و شغب سے دور رہ کر عوامی اصلاح کا بنیادی کام انتہائی خاموشی سے انجام دیا، اس وقت اس کی خبر نہ غیر ملکی دخل انداز انگریز سامراجیوں کو ہوئی نہ شاہ اور اس کے درباریوں کو پتہ چلا، اور نہ سیاسی جماعتوں کے کان کھڑے ہوئے، اس عرصہ میں تحریک پروان چڑھی، اس کے خیالات عام ہوئے، انصار جمع ہوئے اور ان کی ذہنی و فکری اور جسمانی تربیت ہوئی، ان کے درمیان آپس میں ایمان و عمل کے روابط مستحکم ہوئے، مصری معاشرہ کے فرسودہ رسم و رواج کی جگہ صحیح اسلامی تصورات راسخ ہوئے۔ اس ابتدائی مرحلۂ دعوت کا نقشہ خود شیخ بنّا نے درج ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:۔

> یہ تجدیدی دعوت ان حالات میں پروان چڑھی کہ اس وقت مصر اپنے چھوٹے بڑے کسی معاملہ کا خود مالک نہ تھا، غاصب اس پر حکومت کر رہے تھے، سامراجیوں نے اس کو غلام بنا رکھا تھا، اس کے فرزند اس کی آزادی و خود مختاری کے لیے جہاد کی راہ پر گامزن تھے، اندرونی ماحول جماعتی جھگڑوں اور سیاسی کھینچ تان سے پاک نہ تھا، بلکہ اس کو ذاتی مفادات حرید آنچ دیتے رہتے تھے۔ اخوان نے اپنے کو اس پراگندہ میدان میں ٹھونسنا پسند نہ کیا، تاکہ اختلافات نہ بڑھیں اور غاصبوں کو مزید پیر جمانے کا بہانہ نہ ملے، اور وہ اس کی دعوت کو دوسرے رنگ میں پیش کرنے کا فائدہ نہ اٹھائیں۔ حکومتوں پر حکومتیں بدلتی رہیں، اقتدار کی چھین جھپٹ ہوتی رہی، لیکن اخوان مجاہدین کے ساتھ جہاد آزادی میں مشغول رہے اور امت کی تربیت کے نتیجہ خیز میدان میں عوامی بیداری، عرفِ عام کی تبدیلی، ارواح و نفوس کے تزکیہ و تطہیر اور حق و صداقت، جہاد و عمل اور فضائل اخلاق کے اصولوں کی نشر و اشاعت کا کام انجام دیتے رہے۔

اس خاموش جد و جہد کے نتیجہ میں اخوان کو عوامی مقبولیت نصیب ہوئی، ہر زبان پر ان کا نام آیا، ہر جگہ ان کا چرچا ہوا، مصر میں تین سو سے زیادہ شاخیں قائم ہوئیں جو خیر و ہدایت کی راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی تھیں، اس سے مصر میں طاقتور اسلامی شعور بیدار ہوا، اور ایک ایسے ہراول دستہ کی تربیت ہوئی جس نے آئندہ جہاد

کی باگ ڈور سنبھالی۔

دین و دنیا کا جامع تصور

اس ابتدائی دس سالہ مرحلہ کے بعد اخوان کی پانچویں کانفرنس منعقدہ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۸ء میں شیخ بنا نے اخوان کی غرض و غایت وسائل و ذرائع اور طریقہ کار پر ایک طویل خطبہ پیش کیا، جس میں انھوں نے دین و دنیا کے جامع اور مکمل اسلامی تصور کی روشنی میں ملک کے زیرِ بحث سیاسی مسائل پر جماعت کی رائے بھی واضح کی اور اللہ کی سرزمین میں اس کی حکمرانی کا مقصد انتہائی وضاحت اور بیباکی کے ساتھ بیان کیا' اس اہم خطبہ کا ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کے احکام و تعلیمات جامع و شامل ہیں، وہ لوگوں کی دنیا و آخرت کے امور کی تنظیم کرتے ہیں، جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تعلیمات صرف عبادات اور روحانی گوشہ پر مشتمل ہیں ان کا یہ گمان غلط ہے.... اس لیے کہ اسلام عقیدہ و عبادت، وطن و شہریت، دین و حکومت، روحانیت و عمل، قرآن و تلوار .... سب کو شامل ہے، قرآن ان سب موضوعات پر کلام کرتا ہے، وہ ان سب کو اسلام کا مغز اور اس کا غیر منقسم حصہ سمجھتا ہے اور ان کو بہترین طریقہ سے انجام دینے کی نصیحت کرتا ہے، اسی بات کی طرف یہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ (القصص: ۷۷)	اللہ نے تم کو جو کچھ عطا کیا ہے اس سے دار آخرت کمالو اور دنیا میں اپنا حصہ بھی نہ بھولو اور بھلے کام کرو جیسا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کا معاملہ کیا۔

پھر اسلام کی وسعت و جامعیت پر دلالت کرنے والی دیگر آیات کی تلاوت کے بعد شیخ نے فرمایا:۔

اس طرح "اخوان" اللہ کی کتاب سے جڑے اور اس سے رشد و ہدایت و رہنمائی حاصل کی تو ان کو یقین ہو گیا کہ اسلام کے یہی کلی اور جامع و شامل معنی مطلوب ہیں، اب اگر امت چاہتی ہے کہ وہ صحیح اسلام کے لحاظ سے مسلمان ہو تو اس پر واجب

ہے کہ اسلام اس کے تمام امورِ زندگی پر محیط ہو، اس کے رنگ میں اپنے کو رنگے، اس کے احکام کی تابعداری کرے، اور اس کے قواعد و تعلیمات کو اسی سے اخذ کر کے ان کے ساتھ چلے.... اگر اس نے صرف عبادات میں اس کا لحاظ کیا اور دیگر امور میں غیروں کی تقلید کی تو ناقص الاسلام امت کہلائے گی اور ان لوگوں کے مشابہ سمجھی جائے گی جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرہ: ۸۵)	کیا تم کتاب کے بعض حصّے کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ تم میں جو ایسا کرے اس کی سزا دنیاوی زندگی میں رسوائی کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے؟ اور قیامت کے دن ان کو سخت ترین عذاب میں ڈالا جائے گا اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ اخوان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی بنیاد اور ان کا سرچشمہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، جن کو اگر امت مضبوطی سے پکڑے رہے گی تو کبھی گمراہ نہ ہو گی۔ اسلام سے متعلق بہت سی آراء اور علوم ان زمانوں اور اقوام کا رنگ لیے ہوئے ہیں جن میں وہ پیدا ہوئیں، اس لیے اسلامی قوانین کو سہولت اور آسانی کے اس اوّلین سرچشمہ سے اخذ کرنا واجب ہے جس سے پہلے امّت نے حاصل کیا تھا اور اسلام کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جیسا کہ سلف صالح میں صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم نے سمجھا تھا اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدود پر رک جانا چاہیے تاکہ ہم اللہ کی پابندی کے علاوہ کسی اور قید میں اپنے کو نہ جکڑ لیں اور ہمارے زمانہ پر اس زمانہ کا رنگ نہ چڑھ جائے جو اسلام کے موافق نہیں ہے، اس لیے کہ اسلام تو ساری بشریت کا دین ہے۔

اسی کے ساتھ اخوان کا عقیدہ ہے ایک عمومی دین کی حیثیت سے اسلام ہر زمانہ کی اقوام و ملّتوں کی زندگی کے تمام امور کو شامل ہے، وہ اس سے بلند و بالا ہے کہ اس زندگی کے خالص دنیوی امور کی جزئیات کو چھیڑے، وہ ہر معاملہ

کے کلی قواعد وضع کر کے ان کی عملی تطبیق کے طریقوں اور ان کے حدود میں چلنے کی رہنمائی کرتا ہے، پھر صحیح تطبیق کی ضمانت کے لیے انسانی نفس کے علاج پر پوری توجہ دیتا ہے جس پر دراصل تمام قوانین کے اخراج، سوچ بچار اور تکوین و تشکیل کا انحصار ہے، لہٰذا اس کے لیے ایسی کارگر دوائیں تجویز کیں جو اس کو خواہشات سے پاک کریں، اس میں غیر صمدی کے میل کچیل کو دھوئیں، اس کو کمال و فضائل کی ہدایت دیں اور ظلم و زیادتی اور کوتاہی پر اس کی تنبیہ کریں.... اس لیے کہ جب نفس پاک صاف ہو کر راہِ مستقیم اختیار کر لیتا ہے تو اس سے صادر ہونے والی ہر چیز صالح اور خوبصورت ہو جاتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ عدل و انصاف قانون کے الفاظ و عبارت میں نہیں بلکہ قاضی کے نفس میں ہوتا ہے، خواہشات و اغراض کا بندہ ایک قاضی انتہائی عدل پر مبنی قانون کی ظالمانہ تطبیق کر سکتا ہے، جبکہ خواہشات نفس اور خود غرضی سے آزاد دوسرا قاضی ناقص اور ظالم ترین قانون کی منصفانہ تطبیق کر سکتا ہے جس میں لوگوں کے لیے خیر و بھلائی اور رحم و انصاف کو ملحوظ رکھا گیا ہو..... اسی وجہ سے کتاب اللہ میں نفس انسانی بڑی توجہ کا مستحق قرار پایا ہے، حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلام کے تربیت یافتہ اولین بشری نفوس کمالِ انسانی کی اعلیٰ ترین مثال اور نمونہ تھے، انہی وجوہ سے کہا جاتا ہے کہ اسلام کا مزاج و فطرت تمام زمانوں اور امتوں کے لیے سازگار رہے اور اس میں ان کی تمام ضرورتوں اور مطالبات کی گنجائش ہے، اسی وجہ سے وہ دوسرے صالح قوانین سے استفادہ کا اس وقت تک منکر نہیں جب تک وہ اس کے عام مسلّمہ اصولوں اور کلی قواعد کے خلاف نہ ہوں۔

اخوان کی اس جامع و کامل فہم اسلام کا نتیجہ تھا کہ ان کے افکار و خیالات میں امت کے تمام اصلاحی مکاتب فکر کے مفید عناصر کی نمائندگی تھی، اس کی تفصیل بھی خود شیخ بنا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

.....آپ کسی تردد کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ اخوان المسلمین:

۱۔سلفی دعوت ہے اس لیے کہ وہ اُس اسلام کی دعوت کی طرف بلاتے

جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف وشفاف چشمہ سے ماخوذ ہو۔
۲۔ **سُنّی طریقہ** ہے اس لیے کہ وہ عقائد وعبادات سمیت ہر معاملہ میں سنتِ پاک پر ممکن حد تک عمل کے لیے اپنے نفوس کو آمادہ کرتے ہیں۔
۳۔ **صوفیانہ حقیقت** ہے اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ خیر وبھلائی کی بنیاد نفس کی پاکی، قلب کی صفائی عمل پر پابندی، مخلوق سے اعراض، اللہ کے لیے محبت اور خیر سے ارتباط پر منحصر ہے۔
۴۔ **سیاسی ادارہ** ہے اس لیے کہ وہ اندرون ملک حکومت کی اصلاح، بیرونی اقوام سے امت مسلمہ کے روابط پر نظر ثانی، عوام کی عزّت وشرافت پر تربیت اور ہر حالت میں ان کے ملّی تشخص کی حفاظت کا مطالبہ کرتے ہیں۔
۵۔ **اسپورٹس کلب** ہے اس لیے کہ اخوان جسمانی ورزش کی طرف توجہ دیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ طاقتور مؤمن کمزور مؤمن سے بہتر ہے، نیز یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم پر تمہارے بدن کا حق ہے"۔... اور یہ بھی معلوم بات ہے کہ اسلامی فرائض وواجبات کی مکمل اور صحیح ادائیگی مضبوط صحت مند جسم کے بغیر ممکن نہیں ہے، نماز روزہ اور حج وزکوٰۃ کی بخوبی انجام دہی کے لیے یقیناً ایسے جسم کی ضرورت ہوتی ہے جو رزق حاصل کرنے کے لیے زندگی کی جدوجہد کی ذمہ داریوں کو برداشت کرسکے، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے وہ ورزشی تربیت اور اسپورٹس ٹیموں پر دیگر اسپورٹس کلبوں کے برابر یا شاید ان سے بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔
۶۔ **علمی وثقافتی رابطہ** ہے اس لیے کہ اسلام نے علم کا حصول ہر مسلم مرد وعورت پر فرض قرار دیا ہے، لہٰذا اخوان کی علمی وادبی انجمنیں واقعتاً علوم وتہذیب کے مدارس اور جسم، عقل اور روح کی تربیت کے ادارے ہیں۔
۷۔ **اقتصادی کمپنی** ہے اس لیے کہ اسلام صحیح طریقہ سے مال ودولت کے کمانے اور اس کو خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں فرمایا ہے:۔

"صالح انسان کے لیے حلال مال کیا ہی خوب ہے!..." نیز ارشاد فرمایا ہے
۲۰۵

"جو شخص ہاتھ سے کام کرتے کرتے تھک ہار جائے اس کی مغفرت ہو گی"... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول ہے: "اللہ پیشہ ور ہنرمند مومن سے محبت فرماتا ہے۔"

۸۔ معاشرتی اصلاح کا نظام ہے اس لیے کہ اخوانی مسلم معاشرہ کی بیماریوں کی طرف دھیان دیتے ہیں اور ان کے علاج کے وسائل تلاش کرتے ہیں تاکہ امت ان سے شفا پائے۔

اغراض ومقاصد

اسلام کے اس جامع اصلاحی تصور کی وضاحت کے بعد شیخ بنّا نے اخوان المسلمین کی غرض وغایت ان کے پیشِ نظر اسلامی خدمت کے کام اور ان کاموں کی انجام دہی کے طریقے اور وسائل پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

اخوان کا مقصد صحیح اسلامی تعلیمات پر ایمان رکھنے والی ایسی نئی نسل کی تشکیل ہے جو امت کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر اسلامی رنگ میں رنگ دے

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (ہم نے) اللہ کا رنگ (اختیار کیا) اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے؟

اس مہم کی انجام دہی میں اخوان کا وسیلہ عرفِ عام کی تبدیلی اور اسلامی تعلیمات پر دعوت کے مددگاروں کی ایسی تربیت ہے کہ جس کے ذریعہ وہ ان تعلیمات کی پابندی کی فکر وعمل میں دوسروں کے لیے نمونہ ومثال بن جائیں... جس اسلام پر اخوان کا یقین وایمان ہے اس کے ارکان میں ایک اہم رکن حکومت بھی ہے، جو تنفیذ پر بھی اسی طرح اعتماد کرتی ہے جس طرح کہ رہنمائی پر اعتماد کرتی ہے۔ تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت پہلے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ حکومت واقتدار کے ذریعہ ان برائیوں پر روک لگاتا ہے جو قرآن کے ذریعہ نہ رک سکیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کو اسلام کا ایک مضبوط دستہ قرار دیا ہے، اسی لیے ہماری فقہی کتابوں میں حکومت کا باب عقائد اور اصولی معاملات میں شمار ہوتا ہے، نہ کہ فروعی مسائل میں، اس لحاظ سے اسلام حکومت اور تنفیذ پر بالکل اسی طرح مشتمل ہے جس طرح وہ تشریع وتعلیم اور قانون وقضاء کو شامل ہے، ان میں سے کوئی چیز

ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی ..... اس لیے اگر کوئی اسلامی مصلح اپنے لیے یہ پسند کر لے کہ وہ صرف فقیہ و مرشد بنا رہے، احکام بتاتا رہے، تعلیمات سناتا رہے، اصول و فروع کی بحثوں کو دہراتا رہے اور اہلِ اقتدار اور اصحاب تنفیذ کے لیے یہ بات چھوڑ دے کہ وہ امّت کے لیے ایسے قوانین بناتے رہیں جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے اور تنفیذی قوت کے بَل پر اللہ کے احکام کی مخالفت پر لوگوں کو آمادہ کرتے رہیں، تو ظاہر ہے کہ ایسے مصلح کی آواز عربی مثل کے مطابق وادی میں پکار اور راکھ میں پھونک کی طرح بے سود ہو گی ....

.... وعظ و ارشاد کے مقام و مرتبہ پر مصلحین کی قناعت کی بات اس وقت تو قابلِ فہم ہو سکتی ہے جبکہ اہلِ اقتدار و تنفیذ کے رویہ سے یہ معلوم ہو کہ ان تک اللہ کی آیات اور احادیث نبوی کی بات پہنچ سکتی ہے، وہ اللہ کے احکام کو توجہ سے سنتے ہیں اور ان کی تنفیذ کرتے ہیں، لیکن فی الوقت جو حالت ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین ایک طرف بے دخل ہیں اور عملاً دوسری طرف غیر اسلامی قوانین نافذ ہیں ... ایسی صورت میں اسلامی مصلحین کی شریعت کے نفاذ کے مطالبہ سے خاموشی اور حکومت سے کنارہ کشی ناقابلِ معافی جرم ہے، جس کے کفّارہ کی اس کے علاوہ کوئی شکل نہیں ہے کہ اٹھ کر ان لوگوں کے ہاتھوں سے قوتِ تنفیذ چھین لی جائے جو دینِ حنیف اسلام کے احکام کو نہیں مانتے۔

یہ واضح و مسلم بات ہے، ہم نے اس کو اپنی طرف سے گڑھ نہیں لیا ہے، ہم نے تو صرف اسلامی احکام کو بتایا ہے، اس لیے اخوان (ابتدائی مرحلہ سے ہی) اپنے لیے حکومت واقتدار نہیں مانگتے، اگر امّت میں کوئی اس ذمہ داری کو اٹھانے، اس امانت کو ادا کرنے اور اسلامی قرآنی منہاج پر حکومت قائم کرنے کے لیے تیار ہو تو وہ اس کے انصار و مددگار اور سپاہی ثابت ہوں گے، لیکن اگر اس کام کے لیے میدان میں کوئی موجود نہ ہوا تو حکومت اخوان کے منہاج میں شامل ہے اور وہ ہر اس حکومت کے ہاتھوں سے اقتدار نکالنے کی کوشش کریں گے جو اللہ کے اوامر و احکام کی تنفیذ نہ کرے ....

جنگ عظیم دوم (۳۹ - ۱۹۴۵ء) سے کچھ پہلے اپنے ایک اور رسالہ بین الامس والیوم میں بھی شیخ بنّا نے اخوان کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی تھی اور

۲۰۷

اسلامی حکومت کا تصور واضح کرتے ہوئے سامراج سے آزادی کا بھی کھل کر ذکر کیا تھا:

اے اخوان!

ہم کیا چاہتے ہیں؟
کیا ہم مال و دولت جمع کرنا چاہتے ہیں جو زائل ہونے والا سایہ ہے؟
کیا عزت و جاہ کی وسعت چاہتے ہیں جو آنے جانے والی حالت ہے؟
یا زمین میں جبروت (قوت و اقتدار) چاہتے ہیں؟ اس بارے میں یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ:۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (الاعراف: ۱۲۸)	بیشک زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

نیز ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ قول بھی پڑھتے ہیں کہ:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (القصص: ۸۳)	وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑائی چاہتے ہیں نہ بگاڑ، اور عاقبت متقی لوگوں کے لیے ہے۔

اللہ گواہ ہے کہ ہم نے ان چیزوں میں سے کچھ نہیں چاہا، نہ ہم نے ان کے لیے کام کیا، نہ ہم نے ان کے لیے کام کیا، نہ ہم نے ان کی دعوت دی، لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ تمہارے دو بنیادی مقصد ہیں:

۱۔ اسلامی وطن ہر غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو، اس لیے کہ یہ ہر انسان کا فطری حق ہے، اس کا انکار ظالم و جابر اور مستبد و مطلق العنان انسان کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔

۲۔ پھر اس آزاد وطن میں خود مختار اسلامی حکومت قائم ہو، جو اسلامی احکام کے تحت کام کرے، اس کے معاشرتی نظام کو نافذ کرے، اس کے صحیح اصولوں کا اعلان کرے اور اس کی حکیمانہ دعوت لوگوں تک پہنچائے۔ جب تک ایسی حکومت قائم نہ ہوگی اس وقت تک تمام مسلمان گناہگار اور اس کے قیام میں

کوتاہی اور اس کے برپا کرنے میں تساہلی پر اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔
آج کے پریشان کن حالات میں یہ بات انسانیت کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے
کہ ایسی حکومت تو قائم ہو اور برقرار رہے جو ظالمانہ اصولوں کا نعرہ دیتی ہے اور
غاصبانہ تحریکوں کی پکار لگاتی ہے، مگر لوگوں میں کوئی بھی ایسا فرد اور جماعت
موجود نہ ہو جو حق و عدل اور امن و امان کے لیے کام کرے۔

عام وسائل

الرسالۃ العامۃ للجماعۃ میں شیخ بنّا نے اخوان کے مقاصد کے حصول
کے لیے عام وسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ہم ان مقاصد کو کیسے حاصل کریں؟

....صرف تقریریں و تحریریں، اسباق و مذاکرات، مرض کی تشخیص اور علاج کی تجویز
بے سود ہیں، ان سے نہ مقصد حاصل ہوتا ہے، نہ داعی کسی غرض و غایت تک
پہنچ پاتے ہیں، بلکہ تمام تحریکوں کے وسائل ہوتے ہیں جن کو اختیار کرنا اور ان
کے لیے کام کرنا پڑتا ہے، یہ عام وسائل جن میں تغیر و تبدیلی بھی نہیں ہوتی وہ یہ ہیں:

۱۔ پختہ ایمان و یقین۔
۲۔ باریک بینی سے مرتبہ تشکیل و تکوین
۳۔ مسلسل جدوجہد

اے اخوان! یہی تمہارے وسائل بھی ہیں، اس لیے اپنے افکار و خیالات پر
ایمان و یقین رکھو، ان پر متحد رہو، ان کے لیے کام کرو اور ان پر جمے رہو۔

بہت سے لوگ کہیں گے کہ ان وسائل کی حیثیت کیا ہے؟ متعدد مفاسد کے
علاج میں یہ کیسے فائدہ مند ہوں گے؟ سود کی بنیاد کے بغیر معاشیات کا نظام
کیسے چلاؤ گے؟ عورت کے مسئلہ میں کیا رویہ اختیار کرو گے؟ طاقت کے بغیر
اپنے حقوق کیسے حاصل کرو گے؟....

اے اخوان! اچھی طرح جان لو کہ شیطان ہر مصلح کے خیالات میں وسوسے پیدا
کرتا ہے:۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (الحج: ۵۲)

پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے وسوسے اور اپنی آیات مستحکم کر دیتا ہے، اور اللہ سب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

ان معترضین کو بتاؤ کہ تاریخ جن گذشتہ اور موجودہ اقوام کے حالات بیان کرتی ہے ان میں عبرت و نصیحت کے پہلو موجود ہیں اور ان سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو امت زندگی کا عزم مصمم کرے وہ فنا نہیں ہوتی۔

مشکلات اور رکاوٹیں

دعوتی تحریکوں کے آتار چڑھاؤ کے بارے میں سنت اللہ کے ادراک و بصیرت کی روشنی میں شیخ بنّاؒ نے اخوان کے مددگار مردانِ کار کو اس دعوت کے راستہ میں پیش آنے والی مشکلات و پریشانیوں کا ذکر 'العقبات فی طریقنا' کے تحت بہت صفائی سے کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

آپ کو یہ بات صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو ابھی تک آپ کی دعوت کی بابت پوری خبر نہیں ہے، جس دن ان کو اس کا علم اور اس کے اغراض و مقاصد کا ادراک ہوگا اس دن ان کی طرف سے سخت دشمنی اور سنگدلانہ معاملہ سے تمہارا واسطہ پڑے گا اور تم کو بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں پیش آئیں گی، صرف اس وقت تم حقیقی معنی میں اہل دعوت کی صبر آزما راہ پر گامزن ہونے کی ابتدا کرو گے ..... ابھی تک تو تم غیر معروف ہو، دعوت کے تمہیدی کام میں لگے ہوئے ہو اور جدوجہد اور جہاد کی مطلوبہ تیاری کر رہے ہو۔ حقیقتِ اسلام سے عوام کی بے خبری تمہارے راستہ کی رکاوٹ بنے گی... اہل دین اور سرکاری علماء میں ایسے افراد ملیں گے جو تمہاری فہم دین پر تعجب کا اظہار کریں گے اور اس کی راہ میں تمہارے جہاد پر نکیر کریں گے .... حکومتوں کے سربراہ و رہنما اور اہلِ جاہ و اقتدار تمہارے ساتھ بغض و حسد کا معاملہ کریں گے .... تمام حکومتیں تمہارے خلاف یکساں اٹھ کھڑی ہوں گی اور ہر حکومت تمہاری سرگرمیوں پر پابندی لگانے اور تمہارے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرے گی۔[۲۱۰]

غاصب تمہارے مقابلہ اور تمہاری دعوت کے نور کو بجھانے کے لیے ہر ہتھکنڈہ استعمال کریں گے، اس مقابلہ میں وہ کمزور اور اخلاق سے عاری حکومتوں کے سامنے مدد کے لیے دستِ سوال دراز کریں گے اور تمہاری طرف ظلم و زیادتی اور بدسلوکی کا ہاتھ بڑھائیں گے.... یہ سب مل کر تمہاری دعوت کے خلاف شکوک وشبہات کا غبار اڑائیں گے اور ظالمانہ الزامات لگائیں گے، حکومت واقتدار، مال دولت اور اثرورسوخ کے بل بوتہ پر اس دعوت پر ہر عیب چسپاں کریں گے اور لوگوں کے سامنے اس کو بدترین شکل وصورت میں پیش کریں گے:۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (الصف: ۸)	وہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، خواہ کفار اس کو ناپسند کریں۔

اس وقت تم تجربہ اور امتحان وآزمائش کے دور میں داخل ہوگے، قید وبند سے پالا پڑے گا، بے گھر بے در کیے جاؤ گے، تمہارے ادارے ضبط کیے جائیں گے، کام معطل ہوں گے، گھروں کی خانہ تلاشی ہوگی، اور اس ابتلا وآزمائش کی مدت طویل بھی ہوسکتی ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ (العنکبوت: ۲)	کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔

لیکن اس امتحان وآزمائش کے بعد اللہ نے مجاہدین کی مدد اور اچھے کام کرنے والوں سے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ	اے لوگو! کیا میں تم کو ایسی تجارت کے بارے میں بتلاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دلادے؟ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ
وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ۝ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ
نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا
قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ
مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ
طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ
طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى
عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝ (الصف: ۱۰-۱۴)

راہ میں اپنی جان و مال خرچ کرو، یہ تمہارے
لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو، اس صورت میں
وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور ایسی
جنت میں داخل کرے گا جن کے نیچے
نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں اچھے گھر
ہوں گے، یہی بڑی کامیابی ہے، اور
تمہاری دوسری پسندیدہ چیز اللہ کی مدد
اور جلدی حاصل ہونے والی فتح ہے،
مومنین کو یہ خوشخبری سنا دیجیے، اے ایمان
والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسے
کہ عیسیٰ بن مریم نے اپنے حوارین سے
کہا تھا: اللہ کے لیے کون میرا مددگار
بنتا ہے؟ حوارین نے جواب دیا:
ہم اللہ کے مددگار ہیں، پھر بنی اسرائیل
کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے
کفر اختیار کیا، تو ہم نے ایمان لانے والوں
کی تائید کی اور وہ غالب ہوئے۔

سنت اللہ کی اس تفصیلی روداد کے معلوم ہونے کے بعد بھی کیا تم کو اللہ کے انصار بننے پر اصرار ہے؟

عملی سیاست میں حصہ لینے کا اقدام

اخوان کی تشکیل کا ابتدائی دس سالہ مرحلہ تحریک کے تعارف اور اس کے کارکنوں کی تربیت کا کامیاب تجربہ تھا، اس عرصہ میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی فکر عام ہوئی، سامراجی طاقت برطانیہ اور اس کی سرپرستی کی محتاج کٹھ پتلی بدعنوان حکومتوں کی بداعمالیوں کے خلاف بیزاری پھیلی، زوال پذیر معاشرہ کے فرسودہ رسوم و رواج

کی اصلاح کی فکر پیدا ہوئی اور جوشیلے، جذباتی نوجوان عملی اقدام کے لیے بیتابی سے اپنے مرشد و رہنما کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھنے لگے، غالباً اسی ماحول میں شیخ بناء نے 'خطوطنا الثانیۃ' کے عنوان سے ایک اخوانی ماہنامہ النذیر (ربیع الاول ۱۳۵۷ھ/ مئی ۱۹۳۸ء) کے اداریہ میں اپنی جماعت کے عملی میدانِ سیاست میں اترنے کا اعلان کرتے ہوئے لکھا:

لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہارا اگلا قدم کیا ہے ؟

عوام سے گذر کر ہم عنقریب خواص کو دعوتِ خیر پیش کرنے کے مرحلہ کی طرف منتقل ہوں گے اور قولی دعوت کو عملی جد وجہد سے ملائیں گے، عنقریب ہم اپنی دعوت کے ذمہ دار زعماء و قائدین، حکام و وزراء، عوامی نمائندوں اور ارکان پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں گے، ان کو اپنے مناہج کی دعوت دیں گے، ان کے ہاتھوں میں اپنا پروگرام رکھیں گے اور ان سے بغیر خوف و خطر اور ابہام و غموض وضاحت کے ساتھ مطالبہ کریں گے کہ اسلامی ممالک کے سرخیل اس ملکِ مصر کو اسلام کے راستے پر چلائیں، اس لیے کہ اب وقت میں رواداری اور خاطر مدارات کی گنجائش نہیں ہے .... اگر انھوں نے ہماری دعوت قبول کی اور منزلِ مقصود کی طرف چلے تو ہم ان کی مدد و تائید کریں گے، اور اگر انھوں نے کمزور بہانوں کا سہارا لیتے ہوئے آنا کانی کی تو ہم ہر اُس جماعت و رہنما کے خلاف جنگ کریں گے جو اسلام کی مدد نہ کرے اور اس کی عزت و حکومت کی بحالی کے راستہ پر نہ چلے، ان کے خلاف ہمارے اِس اعلان جنگ میں اُس وقت تک کوئی مفاہمت، مصالحت اور قرار و سکون نہ ہوگا جب تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان حق کا فیصلہ نہ کر دے۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ○ (الاعراف: ۸۹)	اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرمادے! وہی سب سے بہتر فتح نصیب فرمانے والا ہے۔

اقدام کے اس مرحلہ میں اگر انھوں نے تمہاری دعوت کو قبول نہ کیا، اسلامی تعلیمات

کو اپنی راہِ عمل کا منہاج نہ بنایا اور ان کے لیے کام نہ کیا تو تم ان سب سے جو کہ حکومت کے اندر ہیں یا اس سے باہر سخت ترین عداوت مول لو گے ... اگر انھوں نے اللہ کے داعی کی پکار سنی اور تمہارے ساتھ کام کیا تو وہ سب تم سے مل کر ایک مستحکم وحدت میں ضم ہو جائیں گے اور مضبوط و متعاون جماعت بن جائیں گے، اُس وقت وہ متحد ہوں گے، بکھریں گے نہیں، تبادلۂ افکار خیالات کریں گے، تنقید نہیں کریں گے، اس واضح مثبت موقف میں تردد نہ ہوگا، نہ وہ بغض و محبت کے درمیان جھولے گا....

سیاست میں دخل دے کر نہ ہم اپنے لائحہ عمل کی مخالفت کریں گے، نہ اپنے راستہ سے انحراف کریں گے، نہ اپنا مسلک بدلیں گے جیسا کہ ناواقف لوگ کہتے ہیں، بلکہ ہم اس کے ذریعہ اپنے اسلامی طریقہ، محمدی لائحہ عمل اور قرآنی منہج کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوں گے، اس بات میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے کہ اسلام میں سیاست دین کا جزء ہے اور وہ حاکم و محکوم سب کو شامل ہے، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات میں یہ نہیں ہے کہ قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور اللہ کا اللہ کو، بلکہ ان میں تو یہ ہے کہ قیصر اور جو کچھ اس کے قبضہ و اختیار میں ہے وہ سب ایک زبردست طاقت والے اللہ کا ہے۔

اے اخوان! تمہارے جریدہ کے پہلے شمارہ کے صفحات پر میں اس (دوسرے) قدم کا اعلان کر رہا ہوں اور قولی دعوت کے بعد عملی جہاد کی طرف بلاتا ہوں وہ جہاد جس میں قیمت چکانا پڑے گی اور قربانیاں دینی ہوں گی، اللہ اور اسلام کی راہ میں تمہارے اس جہاد کے نتیجہ میں ملازمین ظلم و ستم بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک آزار کا نشانہ بنیں گے .... آزاد شہری چھیڑ چھاڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین دقتوں کا شکار ہوں گے ... خوش حال لوگ قید و بند بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار مشکلات سے گذریں گے :-

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ	یقیناً تم اپنی جانوں اور مالوں میں
وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	آزمائے جاؤ گے اور اہل کتاب و
مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا	مشرکین سے بہت بدکلامی سنو گے،

أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (آل عمران: ۱۸۶)

لیکن اگر تم نے صبر و تقویٰ اختیار کیا تو یہ بڑی ہمت کی بات ہو گی۔

اب آزمائش کے اس آئندہ مرحلہ میں جو ہمارا ساتھ دینا چاہیے وہ تیار ہو جائے اور کمر کس لے، اور اخوان کی جس شاخ یا فرد کے حالات اس کی کمر توڑ دیں اور جہاد کی مشقتیں اس کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوں تو وہ ہماری صف سے تھوڑا دور ہو جائے اور اللہ کے قافلہ کو چلنے دے... پھر انشاء اللہ سب ہم سے فتح کے میدان میں ملیں گے۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ (الحج: ۴۰)

اور یقیناً اللہ ان کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے، بیشک اللہ زبردست طاقت والا ہے۔

اور میں تو تم سے وہی بات کہوں گا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی:

فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (ابراہیم: ۳۶)

پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی سو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

سامراج کے زیرِ انتداب فلسطین کو صہیونی عزائم سے بچانے کے لیے اگرچہ اخوان ۱۹۳۶ء کی فلسطین اسٹرائک میں مادی و معنوی تائید کے ذریعہ سرگرم حصہ لے چکے تھے، لیکن ملکی سیاست میں باقاعدہ داخلہ سامراج اور اس کے زیرِ دست مقامی کمزور حکومتوں سے مزاحمت کے ذریعہ مذکورہ اخوانی کانفرنس ۱۹۳۸ء کے بعد شروع ہوا، اس اقدام کے سود و زیاں سے یہاں بحث نہیں، اس لیے کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کا عمومی اندازہ تو خود شیخ بنّا کو بھی تھا جیسا کہ اقتباس بالا سے واضح ہے، نیز عرصہ سے اس موضوع پر مخالف و موافق نقطۂ نظر سامنے آتے رہتے ہیں لیکن لامتناہی واقعات کے تسلسل سے یہ بات عیاں ہے کہ ابتلاء و آزمائش کا تلخ ترین المناک دور نہ صرف اخوان بلکہ اسلام کے تمام نام لیواؤں کے لیے اس سے بہت زیادہ طول کھینچ گیا جتنا کسی بھی اصلاحی تحریک کے مثبت نتائج کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حکومت و اقتدار کی اصلاح تو الگ رہی خود معاشرہ کی دینی اصلاح، فرسودہ

رسوم و رواج سے آزادی اور مغربی تہذیبی افکار اور اس کے گھناؤنے اعمال سے نجات لاینحل مسئلہ بن گیا اور دینی و لادینی کی خلیج اس سے کہیں زیادہ وسیع و عمیق ہو گئی جتنی کہ اخوان اور اس جیسی دیگر اصلاحی تحریکوں کے ظہور کے وقت تھی۔ اسلامی ممالک سے سامراج کا منحوس وجود اگرچہ زمانہ ہوا اٹھ چکا لیکن نام نہاد آزاد مسلم حکومتوں اور معاشروں پر اس کے ناپاک اثرات کی ہلاکت خیز جکڑ بندیاں اس سے بدرجہا زیادہ مستحکم اور قوی ہو گئیں جن کا ابتدا میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اخوان کے سیاست میں داخلہ کے اعلان کے بعد کے واقعات کا تسلسل درج ذیل ہے۔

اس اعلان کے بعد ملک میں ایک نیا جوش و خروش پیدا ہوا اور مصر میں اخوان کا حلقۂ اثر بہت تیزی سے پھیلنے لگا اور وہ ایک طرح کی عوامی جماعت بن گئی جس کا وزن انگریز سفارت کاروں اور مصری حکام و سیاسی جماعتوں نے اچھی طرح محسوس کیا اور ہر ایک اپنے اپنے طریقہ سے اس کو رام کرنے، استعمال کرنے یا صفایا کرنے کی تدابیر میں لگ گیا، مصر میں یہ قلیل المدت، کمزور، اتحادی حکومتوں کے اقتدار کا دور تھا، ان کو مصر کی قسمت پر مسلط انگریزی سامراج اور چاپلوس شاہی درباریوں کی روز روز کی رخنہ اندازیوں سے اپنے آپ کو بچانے ہی سے فرصت نہ تھی کہ وہ ایک نئی ابھرتی ہوئی اسلامی طاقت کے دینی و سیاسی اصلاحی مطالبات پر کان دھرتے، دوسری طرف انگریزوں نے اپنی دور بینی سے اس نوخیز اسلامی رجحان اور وقت کی عاجز و بے بس حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ کو ہوا دی اور ان کو مسلسل اخوان کے دبانے کے لیے وہ اپنی جان بچانے کے لیے برضا و رغبت استعمال ہوتی رہیں۔

اخوان کے سیاست میں داخلہ کے مذکورہ اعلان کے تھوڑے ہی دن کے بعد جنگ عظیم دوم (۳۹ - ۱۹۴۵ء) شروع ہو گئی۔ مشرق اوسط میں مصر انگریزوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا، لیکن شاہ فاروق (۳۶ - ۱۹۵۲ء) اور وزیر اعظم علی ماہر (۳۹ - ۱۹۴۰ء) دونوں مصر کو جنگ سے دور رکھنے پر متحد تھے، عوامی رجحان انگریزوں کے خلاف تھا ہی، آخر کار علی ماہر کو اپنی وزارت کی قربانی دے کر اس جسارت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان کی جگہ حسن صبری (۲۴ر جون - ۱۵ر نومبر ۱۹۴۰ء) نے وزارت تشکیل دے کر توازن قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن بد قسمتی سے وہ چھ ماہ کے اندر ہی پارلیمنٹ

میں بیان پڑھتے ہوئے وفات پاگئے۔ اس کے بعد مصر میں ان ملی جلی حکومتوں کا دور شروع ہوا جن کی سربراہی بیشتر ان سعدی رہنماؤں کے حصہ میں آئی جو ۱۹۳۷ء میں وفد پارٹی سے نکلے تھے اور ان ہی کمزور حکومتوں کے ہاتھوں برطانوی سامراج نے اخوان کو بار بار آزمائشوں میں مبتلا کیا جن میں سے ہر ایک پہلی سے سخت تر تھی۔

پہلی آزمائش

حسین سری (۱۵ر نومبر ۱۹۴۰ء - ۲ر فروری ۱۹۴۲ء) کی آزاد حکومت کے دوران جنگ عظیم دوم کے اثرات مصری سیاست و معیشت پر پوری طرح نمایاں ہو چکے تھے، لیبیا کی طرف سے مصر پر محوری ممالک کی پیش قدمیاں شروع ہو چکی تھی، معاشرہ میں انتشار اور ملک کی معاشی حالت دگرگوں تھی، انگریزوں کے خلاف عوامی نفرت کھل کر سامنے آچکی تھی جس میں اخوان بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، انھوں نے بھی سامراجی تسلّط سے ملکی آزادی کے لیے ایک عوامی جلسہ منعقد کیا' اور انگریز سفارت کاروں کی مرضی کے مطابق حسین سری کی حکومت نے اس کو بہانہ بنا کر اخوان کے خلاف محاذ کھول دیا' اس کے اخبارات و رسائل (التعارف، الشوری، المنار) ضبط ہوئے، پریس بند ہوا، شیخ بناء کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی لگی، اخوان کے جلسے جلوس خلافِ قانون ٹھہرے، ملکی صحافت میں ان سے متعلق خبروں، بیانات اور تحریروں کا بلیک آؤٹ ہوا، ۲۰ر مئی ۱۹۴۱ء کو شیخ بناء کا صعید کے دور ترین کودہ علاقہ اور سکریٹری جنرل کا دمیاط تبادلہ ہوا، پارلیمنٹ کے دباؤ میں تبادلہ منسوخ ہونے کے بعد قاہرہ واپس ہوئے تو اکتوبر ۱۹۴۱ء میں قید کر لیے گئے، پھر اخوان نے مسجدوں میں دھرنا دینے کی دھمکی دی تو ایک ماہ بعد رہا ہوئے۔ بہر حال ان ظالمانہ کارروائیوں سے بھی اخوان کو فائدہ ہی پہنچا اس لیے کہ ایک طرف عوام میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور نئے مددگار کارکن ملے، تو دوسری طرف ان کو راہِ خدا میں مشکلات و مشقتیں برداشت کرنے کا پہلا تجربہ ہوا، آئندہ کی دشواریاں سامنے آئیں اور ان کا عزم و حوصلہ بڑھا، نیز ملکی امور میں سامراجی مداخلت اور اخوان کے خلاف قومی حکومتوں کو ورغلانے اور ظالمانہ اقدامات پر مجبور کرنے کی پالیسی نے اخوانیوں میں انگریزوں کے

خلاف بیزاری اور عداوت مستحکم کردی۔

ادھر اخوانیوں کو بالواسطہ پریشان کرنے سے متوقع نتائج حاصل نہ ہونے پر انگریزی سفارت کاروں کو خیال ہوا کہ ان سے براہ راست روابط قائم کر کے ان کو ترغیب اور ترہیب کے معروف ہتھکنڈوں سے رام کریں، چنانچہ ۱۹۴۱ء کے اختتام سے یہ کوششیں بھی شروع ہوئیں، لیکن ظاہر ہے کہ شیخ بنّا ملکی وقومی مفادات کے خلاف کسی سودے بازی کے لیے تیار نہ ہوئے تو انگریز اپنی پرانی روش پر اتر آئے اور مقامی حکومتوں کو کھل کر اخوان کے خلاف استعمال کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

مصر کی جانب محوری افواج کی پیش قدمی کی خوشی میں برطانیہ کے خلاف مظاہروں سے ملک کے در و دیوار گونج اٹھے، حسین سری کی حکومت نے شاہ فاروق کی مرضی کے خلاف سامراجی دباؤ میں استعفا دیا اور انگریز سنگینوں کے سایہ میں مصطفی نحاس (۴ر فروری ۱۹۴۲ - ۸ر اکتوبر ۱۹۴۴ء) جیسے وطن پرست لیڈر کی موفدی وزارت بنی تو مصر کے اندرونی امور میں سامراجی مداخلت کا پردہ طشت از بام ہوگیا، نئی حکومت کے استحکام کے لیے نحاس پاشا نے فوراً ہی مارچ ۱۹۴۲ء میں الیکشن کا اعلان کیا، اخوان اپنی کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۱ء میں ملکی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکے تھے، نئے انتخابات میں اسماعیلیہ سے شیخ بنّا، کے حصہ لینے کی خبر مشہور ہوئی تو حکومت پر برطانوی سفارت کا دباؤ اس دھمکی کے ساتھ بڑھ گیا کہ شیخ کی نامزدگی ناجائز قرار دی جائے ورنہ مصر کی نام نہاد آزادی ختم کر کے پھر اس پر انگریز مکمل قبضہ کرلیں گے، نحاس پاشا نے مجبور ہو کر شیخ سے مدد طلب کی، درج ذیل مکالمہ سے اس زمانہ کی لاچار حکومتوں کی عاجزی اور بے بسی آشکارا ہوتی ہے۔

> نحاس پاشا: میرے فرزند! وطنی مفاد کے لیے میں نے وزارت بنائی تھی، کیا تم یہ پسند نہ کرو گے کہ اسی مفاد کے لیے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو؟
> انگریز جنگ عظیم کی وجہ سے مبتلائے مصیبت ہیں اور انھوں نے مجھ سے صراحتًا یہ مطالبہ کیا ہے کہ تم مجلس نمائندگان میں داخل نہ ہوسکو!
>
> شیخ بنا،: جناب والا! یہ کیسی بات ہے؟ حق نامزدگی تو دستور کے سب سے معمولی حقوق میں شمار ہوتا ہے جس کی حفاظت کے لیے آپ مسلسل جدوجہد

کرتے رہے ہیں۔

نحاس پاشا: اے فرزند! دستور اپنی جگہ ہے اور موجودہ حالات چیزے دیگر ہست!
تم نامزدگی واپس لے لو، میں تمہاری جماعت کو پوری آزادی سے کام
جاری رکھنے کی ضمانت دیتا ہوں۔

اس یقین دہانی پر شیخ نے اپنی نامزدگی اس شرط کے ساتھ واپس لے لی کہ اخوان کو معمول کے مطابق اس کی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دی جائے اور شراب خانوں و قحبہ خانوں کو بند کرنے کے لیے سرکاری کارروائیاں عمل میں لائی جائیں۔ وعدہ کے مطابق نحاس پاشا نے اخوان کو جلسے کرنے کی اجازت دے دی، ان کے جرائد و اخبارات پر سے پابندی اٹھالی اور ان کا مطبعہ واپس کر دیا لیکن انگریز ظاہر ہے کہ اس مفاہمت سے مطمئن نہ تھے، وہ تو برادرانِ وطن کے ہاتھوں اس بڑھتے ہوئے اسلامی رجحان کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے، ادھر جنگ کے دوران ہی انگریزوں سے مابعد جنگ فوراً وعدہ آزادی اور انخلا افواج کے معاملات طے کر لینے کے لیے تمام وطنی عناصر کا حکومت پر دباؤ تھا جن میں خواص بھی پیش پیش تھے۔

دوسری آزمائش

انگریزوں کو ایک بار پھر اخوان کو نشانہ بنانے کا موقع ملا اور انھوں نے حکومت کے ذریعہ اس کو پہلے سے سخت آزمائش میں مبتلا کرایا، اس مرتبہ جلسے جلوس، مطبوعات اور دیگر سرگرمیوں پر پابندی کے ساتھ اخوان کی تمام شاخوں کو بھی بند کر دیا گیا، صرف اس کا مرکز عام بچا رہا، اخوان نے حالات کا رخ دیکھتے ہوئے صبر و سکون سے کام لیا اور حکومت سے تصادم کی انگریزی چال کامیاب نہ ہونے دی، حکومت بھی کسی طرح نرم و گرم پالیسی اختیار کر کے اپنی جان بچاتی رہی اور اخوان بھی زبانی و تحریری مشوروں و نصیحتوں پر اکتفا کرتے رہے، لیکن شیخ کو انگریزی سفارت اور اس کے جاسوسی شعبوں کی کھلی دشمنی سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان کو قتل یا جلاوطن کرا کے دم لیں گے اس لیے انھوں نے ۱۹۴۳ء کے وسط میں اخوان کے نام ایک تو الوداعی خط لکھا، افسوس کہ وہ خط تادمِ تحریر ہم کو دستیاب نہ ہو سکا ورنہ اس کا ماحصل یہاں پیش کیا جاتا۔

بہرحال نحاس پاشا کی حکومت کے خلاف ایک طرف مخالف جماعتوں کے وطنی مورچہ کا دباؤ بڑھتا گیا اور دوسری طرف مصر پر محوری افواج کا خطرہ کم ہوتا گیا تو انگریز ان کی حکومت کے جاری رہنے یا نہ رہنے سے سرد مہری برتنے لگے، شاہ نے اس بے رخی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۸ راکتوبر ۱۹۴۴ء کو اس حکومت کو معزول کر دیا، اس تبدیلی کو ظاہری مداخلت کے بغیر بآسانی برسرکار لانے کے لیے اس دن برطانوی سفیر بھی قاہرہ سے باہر چلے گئے تھے۔

تیسری آزمائش

احمد ماہر (۸ راکتوبر ۱۹۴۴ء – ۲۴ رفروری ۱۹۴۵ء) کی نئی سعدی حکومت برسر اقتدار آئی، اس نے اپنی اکثریت حاصل کرنے کے لیے جنوری ۱۹۴۵ء میں نئے الیکشن کرانا ضروری سمجھا، اخوان کے بارے میں اس کا موقف گذشتہ حکومتوں سے مختلف نہیں بلکہ ان سے زیادہ پر تشدد تھا، ڈھٹائی سے اس کا مظاہرہ انتخابات میں کیا گیا، برطانوی سفارت اور مصری حکومت دونوں شیخ بنّا اور دیگر اخوانی رہنماؤں کو ہرانے کے لیے کھل کر میدان میں آگئے اور تمام جائز و ناجائز وسائل دھڑلے سے استعمال کیے، اس کے باوجود جن حلقوں میں شیخ اور ان کے ساتھی جیت رہے تھے وہاں دوبارہ بوگس ووٹنگ کے ذریعہ ان کو ہرایا، جس کی وجہ سے برطانوی سفارت اور حکومت سے اخوان کی شکایات میں مزید اضافہ ہوا اور تناؤ بڑھا۔

انگریزی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اس حکومت کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ جنگ عظیم کے اختتام (یورپ میں مئی ۱۹۴۵ء اور مشرق بعید میں اگست ۱۹۴۵ء) کے قریب خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے لیے اس نے ۲۴ رفروری ۱۹۴۵ء کو پارلیمنٹ میں مصر کے جنگ میں شریک ہونے کی تجویز، منظور کی، لیکن فوراً ہی اس کا خمیازہ وزیر اعظم احمد ماہر کو اپنی جان دے کر چکانا پڑا، اس لیے کہ وطن پارٹی کے ایک نوجوان کارکن عیسوی نے ان کو پارلیمنٹ کی عمارت میں گھات لگا کر قتل کر دیا تھا۔

چوتھی آزمائش

محمود فہمی نقراشی (۲۴ رفروری ۱۹۴۵ء – ۱۵ رفروری ۱۹۴۶ء) ان کے جانشین مقرر

ہوئے ، سابق سعدی حکومت کی طرح ان کی وزارت میں بھی لبرل اور مکرم عبید کے گروہ کے ارکان شامل تھے ، انھوں نے ایک طرف محوری ممالک کے خلاف اعلان جنگ کا "فخر" ۲۶ر فروری ۱۹۴۵ء کو حاصل کیا اور دوسری طرف اپنے پیشرو کے قتل میں اخوان کے ملوّث ہونے کا تاثر دینے کے لیے شیخ بنّا ، اخوان کے جنرل سکریٹری اور دیگر ارکان کو گرفتار کرلیا ، بہانہ یہ بنایا گیا کہ تحقیقات کے دوران قاتل کا یہ خیال معلوم ہوا کہ اعلان جنگ سے پہلے حکومت کو جن ملکی رہنماؤں کی رائے لینا چاہیے تھی ان میں شیخ بنّا ، کا نام بھی تھا ، ظاہر ہے اس مضحکہ خیز دلیل پر یہ حضرات کب تک مقید رہتے ، عدالت نے رہا کردیا ، شیخ نے آزاد ہوتے ہی نقراشی سے ملنا چاہا ، لیکن ملاقات کے بجائے انھوں نے اخوان کے اجتماعات اور دیگر سرگرمیوں پر سخت ترین پابندیاں عائد کردیں ، سفر وحضر میں ان کا تعاقب کرایا اور جی بھر کر پریشان کیا ۔

مابعد اختتام جنگ کے حالات کی روشنی میں اخوان کی عمومی جمعیت نے اپنے اجلاس منعقدہ ستمبر ۱۹۴۵ء میں اپنے بنیادی لائحہ عمل میں ضرورت کے مطابق ترمیمیں کیں ، اس کے اغراض ومقاصد کو مزید واضح وجامع بنایا ، متنوع معاشی کمپنیاں قائم کیں جن سے نہ صرف ان کو مادی فائدہ حاصل ہوا بلکہ مزدور طبقہ میں ان کا کام منظم ہوا ، مئی ۱۹۴۶ء میں ان کا روزنامہ 'الاخوان المسلمون' شائع ہونا شروع ہوا تو ان کی آواز مصر سے باہر عرب ومسلم ممالک میں بھی پہنچنے لگی اور بیرونی ممالک میں بھی ان کا حلقہ اثر پھیلنے لگا ، اندرون وبیرون ملک شاخوں کی تربیت نو کر کے ان کے تنظیمی کام نئے عہدیداروں کے سپرد کئے ۔ ہر شاخ کے صدر اور پھر مرشد عام سے بیعت کے ذریعہ عہد وپیمان کی تجدید ہوئی اور تنگی وآسانی میں اطاعت اور نظم وضبط برقرار رکھنے کی قسم کھائی گئی ۔

اس دوران صرف مصر میں اخوان کے ارکان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ چکی تھی ، ہمدرد اور معاون اس سے کئی گنا زیادہ تھے ، مصر میں اخوان کی شاخوں کی تعداد ایک ہزار اور سوڈان میں پچاس تھی ، ان کے علاوہ عرب ومسلم ممالک میں بھی ان کی شاخیں تھیں ، نیز یورپ وامریکہ میں بھی ان کے ہمنوا اور مددگار تھے ، اس عوامی مقبولیت سے جہاں اخوان کے عزائم وحوصلے بلند ہو رہے تھے وہیں

حکومت، مفاد پرست سیاسی جماعتوں اور انگریز سفارت کاروں کی مخالفت تمام حدود سے تجاوز کر چکی تھی، اس لیے کہ اخوان کی طاقت اور شیخ بنّا کی عوامی قیادت سے ہر ایک کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

بہر حال جنگ کے خاتمہ کے بعد دیگر برطانوی نو آبادیات کی طرح مصر میں بھی ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کی منسوخی، مکمل آزادی اور غیر ملکی افواج کی واپسی کے مطالبات کی جدوجہد زور پکڑ چکی تھی، شیخ بنّا نے ایک بار پھر نقراشی سے ملاقات کی کوشش کی، اس مرتبہ باریابی نصیب ہوئی تو وطنی آزادی اور وادیٔ نیل کی وحدت کے لیے قدم اٹھانے کا مطالبہ پیش کیا، اور اگر انگریز اس جائز مطالبہ کو تسلیم نہ کریں تو ان کے خلاف جہاد کی پیشوائی کا ان کو مشورہ دیا جس میں پوری امت ان کے ساتھ ہوگی، نقراشی نے وطنی مطالبات کی جو یادداشت برطانیہ کو پیش کی اس کا جواب توقع کے مطابق قومی امنگوں کے خلاف اور بات چیت کو ٹال دینے والا تھا، ۲۶ جنوری ۱۹۴۶ء کو جیسے ہی وہ شائع ہوا ملک میں احتجاج اور مظاہروں کا طوفان کھڑا ہو گیا، مظاہرین میں اخوان بھی شامل تھے، یہاں تک کہ طلباء کے ایک بڑے ہجوم کا کوبری (پل) عباس پر پولیس سے سخت تصادم ہوا، گولی لگنے اور نیل میں غرق ہونے سے بہت سی جانیں تلف ہوئیں اور لاتعداد زخمی ہوئے، اس حادثہ کے خلاف احتجاج میں چار وزراء نے ۴ فروری ۱۹۴۶ء کو استعفیٰ دے دیا اور ۱۵ فروری کو یہ بحران نقراشی کی وزارت کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

اسماعیل صدقی (۱۷ فروری - ۸ دسمبر ۱۹۴۶ء) کی آزاد حکومت بنی جس میں لبرل ارکان بھی شامل تھے۔ مذکورہ بالا مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا، طلباء اور مزدور تنظیموں نے ۲۱ فروری کو "یوم انخلاء بیرونی افواج" منایا، برطانوی افواج مقیم قاہرہ سے تصادم میں مزید جانی نقصان ہوا تو اس کی یاد میں ۴ مارچ کو پورے ملک میں "یوم شہداء" کا اعلان ہوا، اس دن پولیس اور برطانوی افواج سے تصادم میں صرف اسکندریہ میں اٹھائیس طلباء کی شہادت ہوئی، قابو سے باہر انتشاری حالات کا رخ موڑنے کے لیے برطانیہ نے فوراً لارڈ کیلرن کی جگہ سر رونالڈ کیمبل کو نیا سفیر مقرر کیا اور ۹ مئی سے مذاکرات شروع ہوئے جو اگرچہ جولائی میں ناکام ہو گئے، لیکن اس دوران

یہ فائدہ ہوا کہ برطانوی افواج نے قاہرہ و اسکندریہ سے نہر سوئز اور اسماعیلیہ وغیرہ کی طرف کوچ کی کارروائی شروع کردی جو آئندہ سال نئی حکومت کے دور میں مکمل ہوئی اور ان علاقوں میں انگریزوں کے زیر استعمال فوجی اڈے، ہوائی پٹیاں اور کیمپ وغیرہ پر مارچ ۱۹۴۷ء میں مصری قبضہ ہوگیا۔ شیخ بناء نے پہلے تمام جماعتوں کی متحدہ قومی کمیٹی تشکیل دینے کی کوشش کی، اس میں تعاون نہ ملا تو حکومت کو انگریزوں سے مذاکرات منقطع کرکے کھلے جہاد کا اعلان کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن پھر اکتوبر میں لندن میں صدقی۔بیفن مذاکرات شروع ہوئے، جن میں وادیٔ نیل کی وحدت کے مطالبہ کو نظر انداز کرکے ۱۸۹۹ء کے معاہدہ کے مطابق سوڈان پر مصری۔برطانوی سیادت کا اعادہ کیا گیا، جس سے خود مصری سرکاری وفد ہی کے کئی ارکان نے اتفاق نہ کیا، اندرونِ ملک طلباء نے نومبر میں وطنی مورچہ برائے وحدت نیل بنایا اور احتجاج و مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا، مظاہرین کی طرف سے قاہرہ اسکندریہ میں ہلکے ہتھیار اور دستی بم وغیرہ کا بھی استعمال ہوا۔

پانچویں آزمائش

اخوان حکومت کی زد پر تھے ہی، دیگر مخالفین کے ساتھ ان کی سرکوبی کا ایک اور موقع حکومت کے ہاتھ آیا، گھروں کا محاصرہ اور تلاشی، قید و بند، ملازمین کے تبادلے اور معطلی، جرائد کی ضبطی، جنرل سکرٹری کے ساتھ دیگر اخوانیوں کی گرفتاری کا لامتناہی سلسلہ قائم تھا کہ ۸ر دسمبر کو یہ وزارت بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

محمود فہمی نقراشی (۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء - ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء) نے دوبارہ سعدی وزارت تشکیل دی، جس میں لبرل ممبران بھی شامل تھے۔ شیخ بناء نے پہلے ہی دن ایک مقالہ میں نئی حکومت کو مشورہ دیا کہ امت کے عزم و ارادہ کا احترام کرتے ہوئے برطانیہ سے بے سود مذاکرات کا سلسلہ ختم کرکے جہاد کا راستہ اختیار کرے، پھر مسلسل حکومت پر تنقید کا سلسلہ جاری رکھا اور شکایت کی کہ اس نے اخوان سے جنگ شروع کرکے اس کے مدارس اور دیگر اداروں کو بند کردیا ہے اور قید و بند اور تعاقب کے ذریعہ ان پر زندگی حرام کردی ہے۔ اخوانی صحافت بھی زور شور سے حکومت پر غیر ملکیوں

کے ساتھ نرمی برتنے، بیرونی کمپنیوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے اور بے روزگاری کے مسئلہ کو حل نہ کرنے وغیرہ کے الزامات عائد کر رہی تھی۔ ۱۹؍جنوری ۱۹۴۷ء کو سوڈان پر مصر و برطانیہ کی مشترکہ سیادت کے معاہدہ ۱۸۹۹ء کی برسی کو طلباء نے "یوم ماتم" کے طور پر منایا اور وادیٔ نیل کی وحدت کا مطالبہ کیا، پھر ۶؍مئی ۱۹۴۷ء کو شاہ فاروق کی تاجپوشی کی برسی پر میٹرو سنیما قاہرہ میں بم کا دھماکہ ہوا۔

نقراشی نے اندرونی انتشار پر قابو پانے کے لیے اور برطانیہ کی لیت ولعل سے عاجز آکر مصر و سوڈان کی آزادی و وحدت کے مسئلہ کو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا، اخوان نے نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ تعاون کے طور پر ۲۶؍جولائی کو ایک وفد نیویارک بھیجا، اگست میں یہ مسئلہ سیکورٹی کونسل میں پیش ہوا، اخوانی وفد کے سربراہ مصطفیٰ مومن نے زائرین کی گیلری سے خطاب کرتے ہوئے مصر کی آزادی، غیر ملکی افواج کے مکمل انخلاء اور وادیٔ نیل کی وحدت کے مطالبات پر مشتمل وہ دستاویز پیش کی جس پر مصری دانشگاہوں کے طلباء کے دستخط ثبت تھے، کونسل کی کارروائی میں رخنہ ڈالنے کے الزام میں ان کو اس سے باہر نکال دیا گیا، تو انھوں نے نیویارک میں مقیم مصریوں کو ساتھ لے کر مصری مطالبات کے حق میں اقوام متحدہ کے باہر مظاہرہ کیا۔ بہرحال ایک ماہ میں واضح ہوگیا کہ کونسل کی وساطت کی کوشش بھی بے سود تھی، بے معنی لفظی الٹ پھیر کے باوجود برطانیہ نہ صرف اپنے موقف پر ڈٹا رہا بلکہ ایک سوچے سمجھے شرارتی منصوبہ کے تحت اس نے سوڈان میں مصر سے علیحدگی کی خود ساختہ تحریک کی ڈھٹائی کے ساتھ ہمت افزائی و سرپرستی شروع کردی اور آخر اس کو الگ کر کے دم لیا۔

آزادی کا معرکہ پورے شباب پر تھا کہ اقوام متحدہ (قائم شدہ ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۵ء) کے مؤسس ممبر مصر کی مخالفت کے باوجود ۲۹ مئی ۱۹۴۷ء کو وہاں سے تقسیم فلسطین کی ظالمانہ قرارداد جاری ہوئی اور عربوں کے سامنے ایک اور محاذ جنگ قائم ہوگیا جس کی دلدل سے آج تک عرب باہر نہ نکل سکے۔

فلسطین پر برطانوی انتداب کے خاتمہ کے ساتھ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کی صہیونی ریاست کے قیام کا اعلان ہوا اور پہلی عرب۔ اسرائیل جنگ چھڑ گئی، اخوان

بھی اس دوران میں جہاد کی تیاری کر چکے تھے۔ انھوں نے شیخ فرغلی کی امارت میں عرب لیگ (قائم شدہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء) کے ماتحت افواج کے شانہ بشانہ اس جنگ میں اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سر دھڑ کی بازی لگا دی، انھوں نے فالوجا میں مصری فوج کے خلاف صہیونی حصار کو توڑا، نقب کے اول معرکہ کفار دیر وم میں بہادری کے جوہر دکھائے، خلیل وبیت لحم کا مردانہ وار دفاع کیا...سیکورٹی کونسل کی بار بار مداخلت سے یہ پہلی نام نہاد جنگ یا جھڑپیں مختصر ثابت ہوئیں اور ۲۲ مئی، ۱۱ جون، ۱۵ جولائی، ۱۷ اکتوبر اور ۲۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کی وقتی جنگ بندیوں کے بعد آخر شریک جنگ ممالک مصر سے ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء، لبنان سے ۲۳ مارچ، اردن سے ۳ اپریل اور سوریا سے ۲۰ جولائی کو الگ الگ عام جنگ بندی معاہدے کرا دیئے گئے۔

جہاد فلسطین میں اخوان کی بہادرانہ عملی شرکت کے نتیجہ میں ان کی عوامی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ نے مخالفین کے غیظ وغضب کو مزید مشتعل کر دیا اور ملکی وغیر ملکی مفاد پرست عناصر کی ملی بھگت اور منصوبہ بندی سے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی منصوبہ بندی عمل میں آئی چنانچہ شائع شدہ دستاویزات سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران ہی ۹ جولائی ۱۹۴۹ء کو مصر میں مقیم غیر ملکی باشندوں نے برطانوی سفیر متعینہ قاہرہ کو شکایت نامہ بھیجا کہ یہودیوں سے ہمدردی کے شبہ میں سڑکوں پر ان کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں اور پولیس ان کو روکنے کے لیے مداخلت نہیں کر رہی ہے، افواہیں عام ہیں کہ ان حوادث میں اخوان کا ہاتھ ہے، اس لیے آپ کا بڑا احسان ہوگا کہ ان واقعات کو روکنے کے لیے ضروری کارروائی کریں۔ اس کے علاوہ مصری وکیل شمس الدین شناوی کے تلاش کردہ دو مراسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰ نومبر ۱۹۴۸ء کو اسماعیلیہ کے اطراف میں فاید کے مقام پر برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے سفراء کے ایک جلسہ میں یہ بات طے ہوئی کہ برطانوی سفارت مصری حکومت پر دباؤ ڈالے کہ وہ اخوان کو غیر قانونی جماعت قرار دینے کے لیے ضروری کارروائی کرے۔ پھر برطانوی سفارت نے نقراشی کو اس فیصلہ کی اطلاع دیتے ہوئے زبانی طور پر یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اخوان کو غیر قانونی قرار نہ دیا گیا تو برطانوی افواج دوبارہ قاہرہ واسکندریہ پر قبضہ کریں گی۔ شیخ بنّا کو حکومت پر سفارتی دباؤ کا اندازہ ہوا تو انھوں نے نقراشی سے

ل کر جماعت کا موقف واضح کرنے اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، مایوس ہو کر شاہ فاروق کو حالات سے مطلع کرنا چاہا تو ان کے دفتر کے سربراہ ابراہیم عبدالہادی نے (جو بعد میں نقراشی کے جانشین ہوئے) سکریٹری وزارت داخلہ بریگیڈیر عبدالرحمن عمار سے مفاہمت کی صلاح دے کر ٹال دیا، سکریٹری نے ملاقات پر اگرچہ شیخ کے ساتھ اپنے قدیم روابط کا لحاظ کیا، لیکن قاہرہ و اسکندریہ پر دوبارہ برطانوی قبضہ کی دھمکی کے سامنے نقراشی کی مجبوری بھی واضح کر دی

چھٹی آزمائش

بالآخر اخوان پر طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے اور ملکی دستور کو بدلنے کی "بدنیتی" کا الزام عائد ہوا، اور اس جرم میں ان کے ساتھ سخت گیری کا وہ سنگین معاملہ روا رکھا گیا جس کی اب تک کسی سابق حکومت نے جرات نہیں کی تھی، موجودہ حکومت کے لیے یہ سنگدلانہ کارروائی اس لیے بھی زیادہ آسان ہو گئی کہ ابتداء جنگ فلسطین سے ایک سال کے لیے اس نے مارشل لا نافذ کر رکھا تھا، جس کے لامحدود اختیارات کو دشمن کے بجائے اہل وطن مخالفین پر استعمال ہونا تھا، بالآخر یہی ہوا، ۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو روزنامہ الاخوان المسلمون غیر معینہ مدت کے لیے بند ہوا، ۸ دسمبر کو اخوان کو کالعدم قرار دے کر بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں شروع ہوئیں اور جراتمندانہ جہادی کارناموں کے صلہ میں غازی مجاہدین فلسطین کو پہلے عارضی کیمپوں میں قید کیا گیا، پھر ہتھکڑیاں لگا کر ہاکیسٹپ قید خانہ اور وہاں سے طور منتقل کر کے ان کو عام زندگی سے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے ان کی تمام شاخیں اور پیشہ ورانہ یونینیں تو معطل ہو ہی چکی تھیں اب دیگر فوجی احکام کے تحت ان کے تمام رفاہی ادارے مکاتب و مدارس، ہسپتال اور کلینک اور فلاحی تنظیمیں) تجارتی کمپنیاں (جیسے عرب معدنیات کمپنی، عرب پلاسٹک کمپنی، ٹیکسٹائل کمپنی، انشورنس کمپنی، مطبعہ وغیرہ) اور نیم فوجی تربیتی مراکز مع اسلحہ ضبط ہوئے اور منقولہ و غیر منقولہ تمام جائدادیں مع مالیات کے وزارت امور اجتماعی کے سرکاری تصرف میں دیدی گئیں۔ حکمراں جماعت کے ترجمان جریدہ "آخر ساعۃ" قاہرہ نے اسی موقع پر اپنے حاسدانہ تبصرہ میں اس اقدام کا پرجوش

خیر مقدم کرتے ہوئے اخوان کی مذکورہ بالا وسیع امپائر کا نظر بد سے تذکرہ کیا تھا اور لکھا تھا:

حکومت نے ایک ایسی جماعت سے نجات حاصل کی ہے جو نہ صرف اس کی مضبوط ترین دشمن ہو سکتی تھی بلکہ اپنے مدارس، ہسپتالوں، رفاہی اداروں، کارخانوں، کمپنیوں اور اسلحہ کے اعتبار سے ایک سلطنت کے مشابہ تھی۔

معرکۂ فلسطین کے خلاف توقع اچانک اختتام کے صدمہ اور اپنی حکومت سے شکایت کے ماحول سے ابھی لوگ باہر نہ نکلے تھے کہ بیرونی دباؤ کے تحت اخوان پر پابندی اور اس کے افراد پر سنگدلانہ جبر و قہر نے جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا اور حکومت کی گرفت سے آزاد روپوش نوجوانوں نے بے قابو ہو کر ان حکومتی عہدیداران اور پولیس افسران کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں جو بیرونی عناصر کا آلہ کار بنے تھے اور جنھوں نے ان کے مجاہد بھائیوں کے ساتھ بہیمانہ اذیت رسانی کا معاملہ کیا تھا، پریشان حال فکرمند شیخ بنّا ایک طرف ان تشدد آمیز واقعات کی مذمت کر کے امن و امان قائم رکھنے کی اپیلیں کر رہے تھے، اور دوسری طرف نقراشی سے ملاقات کی کوشش میں تھے کہ مسائل متعلقہ کسی طرح بات چیت سے سلجھ جائیں اور حالات قابو میں آجائیں، لیکن شاید حکومت اپنے سرپرست آقاؤں کی مرضی کے خلاف نہ شیخ سے ملاقات کر سکتی تھی، نہ گفتگو اور نہ معاملات کو حل کرنے کی جرأت۔ جبر و تشدد کے اس غیر یقینی ماحول میں شیخ تن تنہا رہ گئے تھے، اخوان کے تمام ممتاز رہنما گرفتار تھے، صرف شیخ کو بدنیتی سے جاسوسی محکموں کی نگرانی میں جیل سے باہر رکھا گیا تھا۔ شیخ اور اخوان کو نشانہ بنانے کا ایک اور موقع حکومت کو اس وقت ملا جب کہ پولیس افسر کے بھیس میں کسی شخص نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو وزارت داخلہ کی لفٹ کے سامنے لگاتار تین گولیوں سے وزیر اعظم نقراشی کا خون کر دیا، حسب معمول اس کا الزام بھی اخوان کے سر گیا۔ شیخ بنّا نے اس مجرمانہ فعل سے بھی جماعت کی برأت کا اعلان کیا لیکن ہٹ دھرمی کے ماحول میں مذمت، برأت اور معذرت کے بیانات کچھ کام آنے والے نہ تھے۔

ساتویں آزمائش

نقراشی کے قتل کے فوراً بعد ابراہیم عبدالہادی (۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء - ۲۶ جولائی

۱۹۴۹ء) کی سعدی وزارت فوراً تشکیل پاگئی، اس میں لبرل، آزاد اور نیشنل پارٹی کے ارکان شامل تھے، اس حکومت کے بنتے ہی شدت پسند تنظیموں کے خلاف اقدامات کے ساتھ اخوان پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی، اگرچہ اس کے صفایا کے لیے بیشتر سنگین کارروائیاں تو سابق حکومت ہی انجام دے چکی تھی، اب نئی حکومت کے ہاتھوں شیخ کی زندگی کے خلاف دائرہ تنگ ہونا شروع ہوا، جس کا ان کو اور دیگر مخلصین کو پورا احساس تھا، چنانچہ ایک دوست کے ہوشیار کرنے اور احتیاط برتنے کے مشورہ پر انھوں نے بے بسی سے فرمایا تھا:

> میں کیا کروں؟ انھوں نے اخوان کو گرفتار کر کے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے، میں نے ان سے اپنی گرفتاری کا مطالبہ کیا جس کو انھوں نے رد کر دیا، میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر اخوانی مجرم گردہ ہیں تو میں ان کا سرغنہ ہوں، مجھے پہلے گرفتار کرنا چاہیے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس طرح آزاد چھوڑ کر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو... انھوں نے میرا ٹیلیفون کاٹ دیا.... میرا اجازت یافتہ ریوالور واپس لے لیا.... میرے بھائی عبدالباسط کو جو میری نقل و حرکت میں ساتھ ساتھ رہتا تھا گرفتار کرلیا، میرے گھر کے سامنے سے میری موٹر اٹھالے گئے، مجھے بیرونی سفر سے روک دیا، تنہا میں ایک اخوانی کے دیہاتی ٹھکانہ پر جانے کی اجازت مانگی تو اس کو رد کردیا، ایکسٹیب جیل خانہ میں گرفتار شدہ اخوانیوں سے ملاقات کرنا چاہی تو اس کی بھی اجازت نہ دی....

شہادت

شیخ بنا اسی گومگو میں تھے کہ حالات کو معمول پر لانے کے لیے کیا تدبیر کی جائے کہ ان کی زندگی کے خلاف سامراج اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کے تعاون سے تیار کردہ ناپاک سازشِ قتل کی تکمیل کا آخری دن آپہنچا، ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی صبح جمعیۃ الشبان المسلمین کے نوجوان بازو کے سربراہ محمد لیثی جمعیت کے سکریٹری ناغی (جو اس وقت کے وزیر اعظم ابراہیم عبدالہادی کے عزیز بھی تھے) کا یہ پیغام لائے کہ وہ اخوان اور اس کے گرفتار شدہ ارکان کے بارے میں وزیر اعظم

کی طرف سے شیخ تک کوخوش آیند خبریں پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے لیے شام کا وقت مقرر ہوا، شیخ وقت پر جمعیت پہنچ گئے، ملاقات کے بعد ساڑھے سات بجے شام کو شیخ اپنے وکیل اور بہنوئی عبدالکریم منصور کے ساتھ عمارت سے باہر نکلے، لیثی نے چپراسی سے ٹیکسی منگوائی، شیخ مع اپنے بہنوئی کے اس پر سوار ہوئے، وہ روانہ ہوہی رہی تھی کہ گھات میں لگے ہوئے مجرموں نے حملہ کر دیا، اس بزدلانہ حملہ کی تفصیل شیخ کے بہنوئی کی عدالتی گواہی کے الفاظ میں یہ تھی:

"ہم جمعیت سے باہر نکلے، سڑک کے اس چوراہہ پر جو جمعیت اور پانی کے نلکے کے درمیان واقع ہے میں نے تین اشخاص کو دیکھا، لیکن شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، ہم ٹیکسی پر سوار ہوئے... تو اس کے دونوں طرف سے گولیاں چلنا شروع ہوئیں، ایک مجرم نے میری طرف کا دروازہ کھولنا چاہا، جس کی میں نے مزاحمت کی، لیکن اس نے دروازہ کھول لیا اور پستول داغ دیا، پہلی گولی باہر سے شیشہ پر لگی تھی جس سے وہ چور چور ہوا تھا لیکن مجھے چوٹ نہ آئی تھی، مگر دروازہ کھلنے کے بعد کی گولی میرے بازو میں اتر گئی...

اسی لمحہ میں نے دیکھا کہ دوسرا مجرم شہید امام کی طرف کا دروازہ کھولنے کے لیے زور لگا رہا ہے، دروازہ کھلتے ہی اس نے امام پر ریوالور داغ دیا، امام اس کے پیچھے لپکے، لیکن معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے گولی لگ چکی ہے، جب وہ واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا: کیا آپ نے مجرم کو پکڑا؟

انھوں نے فرمایا: نہیں! مجرمین موٹر نمبر ۹۹۷۹ میں سوار ہو کر بھاگ گئے۔

میں نے سوال کیا: آپ نے نمبر دیکھ لیا؟

انھوں نے فرمایا: ہاں!

اس کے بعد ہم اسعاف کے لیے روانہ ہو گئے۔

اسعاف جمعیت ہی کی سڑک پر کچھ آگے بڑھ کر فرسٹ ایڈ کی فوری خدمات کا مرکز ہے۔

اس حادثہ کے دوسرے عینی شاہد محمد لیثی نے اپنی گواہی کے بیان میں مزید تفصیل اس طرح بیان کی:

گولی چلنے کے بعد جب میں ایمبولنس طلب کرنے کے لیے جمعیت کی عمارت میں واپس آیا تو ٹیلیفون کا ریسیور الگ رکھا ہوا تھا، اس کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ ٹیلیفون پر بات کرنے کے لیے کوئی میرا منتظر ہے، ریسیور اٹھاتے ہی معلوم ہوا کہ سیاسی پولیس کے افسر محمد جزار بول رہے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ ابھی شیخ بنا پر قاتلانہ حملہ ہوا....

انھوں نے پر سکون آواز میں کہا: نہیں بھائی! پھر پوچھا، مر گئے کہ نہیں؟
اس وقت میں نے دیکھا کہ ٹیکسی روانہ ہو رہی ہے، میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا یہاں تک کہ اسعاف پہنچ گیا، وہاں پر مجھے گندمی رنگ کا ایک نوجوان (مصری ڈھیلا ڈھالا، عوامی لباس) جلباب اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے ملا، اس نے کہا: میں نے قاتلوں کی موٹر کا نمبر دیکھ لیا ہے، پھر اس نے نمبر ۹۹۷۹ بتایا جس کو میں نے کاغذ پر لکھ لیا، اسی دوران قصر العینی ہسپتال لے جانے کے لیے شیخ بنا ایک اسٹریچر پر نکلے، اور میں نے اس نوجوان کو جمعیت کی طرف روانہ کیا کہ وہاں میرا انتظار کرے۔

متعلقین و متوسلین کو شکایت رہی کہ ہسپتال میں شیخ کو علاج کے بغیر ڈالے رکھا گیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، دشمنوں اور حریفوں نے سمجھا کہ انھوں نے مؤسس مرشد و قائد کے خون ناحق کے ساتھ ان کی جماعت کا بھی صفایا کر دیا، یقیناً یہ اخوان کی ابتلا و آزمائش سے بھری ہوئی آخری آٹھ سالہ مختصر تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک و صبر آزما سانحہ تھا، لیکن اللہ کے مخلص بندے ایسے حادثات سے ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلے ہیں، حوصلہ مند اہل عزیمت اخوانیوں نے شیخ کی شہادت کے بعد بھی اسلام کی سربلندی کے لیے مصر اور عالم عرب کے چپہ چپہ پر عہدِ وفا کی نئی تاریخ بار بار لکھی ہے، خدا داد حکمت و بصیرت سے اس کا ابدی پیغام ساری دنیا میں پوری آب و تاب کے ساتھ پہنچا دیا ہے، اور آخری فیصلہ رب کائنات کے ہاتھ میں چھوڑ دیا ہے۔

تعارف وتبصرہ

شیئر بازار میں سرمایہ کاری

موجودہ طریقۂ کار اور اسلامی نقطۂ نظر

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی

ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

اشاعت اپریل ۱۹۹۹ء صفحات ۱۵۶ قیمت پیپر بیک ۴۵ روپے مجلد ۶۰ روپے

اسٹاک مارکیٹ موجودہ معیشت کا بہت اہم ادارہ ہے۔ وسائل کے موثر تعین کا فروغ ہر معیشت کا بنیادی ہدف ہوتا ہے اس کے لیے معلومات Information کی وقوع پذیری Production اور منتقلی Transmission کا عمل اشد ضروری ہے۔ اسٹاک مارکیٹ اس سلسلے میں دو طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ پہلی قسم ماضی میں کی گئی سرمایہ کاری کے نتائج سے متعلق ہوتی ہے جسے Retrospective یا Backward looking رول کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم مستقبل میں سرمایہ کاری کے امکانات سے متعلق ہوتی ہے جسے prospective یا Forward looking رول کہا جاتا ہے۔ حصص کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ان چیزوں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ موجودہ دور میں اسٹاک مارکیٹ کی اہمیت اس لیے زیادہ ہوگئی ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ مالی اثاثوں Financial Assets میں سرمایہ کاری کے طریقہ کو اختیار کر رہے ہیں۔

اسٹاک مارکیٹ کا عمل، حصص کی ماہیت اور اس سے متعلق اصطلاحات کا سمجھنا ایک عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ اگرچہ انگریزی میں اسٹاک مارکیٹ پر کتابوں کی کمی نہیں ہے لیکن اردو میں اس طرح کی کتاب کی کمی عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس خلا کو پُر کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

مذکورہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں سرمایہ کاری سے متعلق اسلامک فقہ اکیڈمی کا سوالنامہ اور تجاویز بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ باب اول مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کی ضرورت اور حقیقت سے متعلق ہے۔ اس میں سرمایہ جمع کرنے کے مختلف

طریقوں، حصص کی اقسام وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم حصص کے ابتدائی بازار Primary Market کی بابت ہے۔ اس میں ابتدائی اجراء New issued سے متعلق مراحل steps کو بیان کیا گیا ہے۔ باب سوم حصص کے ثانوی بازار Stock Exchange کے تفاعل Functioning پر مبنی ہے۔ باب چہارم میں بانڈ اور میعادی جمع اسکیموں کا ذکر ہے۔ باب پنجم میں باہمی فنڈ Mutual Funds کا ذکر ہے۔ باب ششم میں شیئرز کی قیمتوں پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا بیان ہے۔ باب ہفتم میں شیئرز بازار سے متعلق بدعنوانیوں اور شکایات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ باب ہشتم شیئرز میں سرمایہ کاری سے متعلق علماء کی آراء پر مبنی ہے۔ باب نہم میں اسٹاک مارکیٹ پر مسلم ماہرینِ معاشیات کے نظریات کا جائزہ ہے۔ باب دہم میں کمپنیوں کے حصص پر زکوٰۃ کے مسئلہ پر بحث ہے۔ مختصر یہ کہ اسٹاک مارکیٹ سے متعلق وہ سوالات جو ایک آدمی کے ذہن میں ابھرتے ہیں، ان کے تسلی بخش جوابات کتاب میں موجود ہیں۔ کتاب سے علماء کرام کو بھی اسٹاک مارکیٹ کے طریقۂ کار کو سمجھنے اور صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

مالی اثاثوں Financial Assets کی قیمتوں کا تعین عام اشیاء کی قیمتوں کے تعین سے مختلف ہے۔ مالی اثاثوں کی قیمتوں کا تعین دوسرے اثاثوں کی مالیت کی مناسبت سے ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر مناسب تھا کہ ایک باب اثاثوں کی قیمتوں کے تعین سے متعلق نظریات پر ہوتا جیسے Portfolio Theory و Capital Pricing Model و Arbitrage Pricing Theory اور EFFICIENT MARKET HYPOTHESIS اسی طرح Derivatives جیسے Options اور Futures کا بہت مختصر بیان ہے۔ اس کی پیچیدگیوں کے مدِّنظر اس پر کم از کم ایک مکمل باب درکار تھا۔ مصنف اس پر ایک علٰحدہ کتاب مرتب کر سکیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی بعض اصطلاحات کو سرسری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر Arbitrage کا عمل۔ اربٹراج دو بازاروں میں حصص کی قیمتوں میں فرق سے صرف فائدہ اٹھانے کا نام نہیں ہے بلکہ مالیاتی معاشیات Financial Economics میں اس کا مفہوم کہیں وسیع ہے۔ درحقیقت مالی اثاثوں کی قیمتوں کے تعین کا مدار اسی پر

ہے۔ اصطلاحات کے ترجمے کہیں کہیں پر تشنہ محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں ایک طرح کی مجبوری بھی ہے۔ بعض اصطلاحات کا صحیح ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ کچھ عرصہ قبل ترقی اردو بیورو نے معاشیات اور بعض دوسرے مضامین پر اردو میں اصطلاحات کی فرہنگ تیار کروائی تھی۔ اسٹاک مارکیٹ سے متعلق اصطلاحات کے ترجمہ کے لیے اس طرح کی کوشش کی ضرورت ہے۔ ترقی اردو بیورو کی فرہنگ میں ارٹبراج کا ترجمہ کثیر رخی مبادلہ کیا گیا ہے۔ (مصنف نے اس کا ترجمہ نہیں دیا ہے) مالیاتی معاشیات Financial Economics کے پس منظر میں اس کا ترجمہ 'درختِ زر' زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسٹاک مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کو ناپنے والے اشاریہ Index سے ہر شخص روزانہ ہی دو چار ہوتا ہے۔ اسٹاک مارکیٹ کے اشاریہ Stock Market Index کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ اگر اسے ایک مثال سے واضح کر دیا جاتا تو یہ الجھن بھی رفع ہو جاتی۔ حصص پر زکوٰۃ سے متعلق مصنف نے تجویز پیش کی ہے کہ زکوٰۃ اوسط مالیت پر ہو اور اس کے لیے سالانہ زیادہ، کم اور حالیہ قیمت کا اوسط دیکھنا بہتر ہوگا۔ احقر کی رائے میں اگر اوسط مالیت پر زکوٰۃ دینا ہو تو ۱۲ مہینوں کی اوسط (کم اور زیادہ قیمت) کا اوسط زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ حصص کی قیمتوں میں تغیّرات کو معتدل کر دے گا اور حصص کی صحیح مالیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے، اس لیے جو گزارشات اوپر کی گئی ہیں انھیں کتاب کی خامی پر محمول نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان کا تعلق ذوق Taste سے بھی ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ اور سرورق جاذبِ نظر ہے۔ امید ہے کہ اردو داں طبقہ کو اسٹاک مارکیٹ کے رموز و نکات سمجھانے میں بہت مفید اور معاون ہوگی۔

(ولید احمد انصاری)

خدمتِ خلق یا حقوق العباد

عبداللہ دانش

ناشر: علامہ اقبال ریسرچ فاؤنڈیشن نئی دہلی۔ ۲۵ صفحات ۲۷ قیمت ۱۵ روپے

سماجی خدمات کا عصر حاضر میں بہت چرچا ہونے لگا ہے۔ اس میدان میں انفرادی، اجتماعی اور حکومتی ہر سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں اور اس کام کو تمام مذاہب

نظریات اور ممالک نے اہمیت دی ہے۔ اسلام انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل نظام رکھتا ہے اس لیے اس میں بھی حقوق العباد کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، ان کی ادائیگی کو لازم کیا گیا ہے اور اس سے چشم پوشی پر سرزنش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں حقوق العباد پر عصری تناظر میں بحث کی گئی ہے۔

ابتدا میں سماجی خدمات پر ایک تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور انھیں انجام دینے والوں کی سوچ اور مقاصد سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں برہمن ازم، گاندھی واد اور عیسائی مشنریوں کے اندازِ فکر، محرکات اور طریقۂ کار کی وضاحت کی گئی ہے نیز سماجی خدمات میں مصروف معاصر اداروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلام میں انسانوں کی خدمت پر کتنا زور دیا گیا ہے اور اس سے روگردانی کا کیا انجام بیان کیا گیا ہے؟ اسلامی تعلیمات سے تحریک پاکر مسلمانوں نے ماضی میں خدمتِ خلق کے کیا کیا کام انجام دیے ہیں؟ مصنف نے قرآن و حدیث اور صدرِ اول کے واقعات کے ذریعہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں افسوس کا اظہار کیا ہے کہ موجودہ دور میں امتِ مسلمہ نے اس کام کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی ہے۔

یہ کتابچہ اپنے موضوع پر مفید معلومات پیش کرتا ہے۔ البتہ اس میں آیات اور احادیث وغیرہ کے حوالوں کا اہتمام نہیں ہے۔ بعض مقامات پر (مثلاً ص ۳۵، ۳۹، ۴۶) آیات کو صحیح نقل نہیں کیا گیا ہے۔ زبان و بیان اور پروف کی غلطیاں بھی کھٹکتی ہیں۔ اس موضوع پر کئی سال قبل ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی سے مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب "اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور" (صفحات ۱۲۶) شائع ہو چکی ہے جس میں بنیادی مصادر کی روشنی میں اسلام میں خدمتِ خلق کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب "اسلام میں خدمت خلق کا تصور" کا ہندی ترجمہ اسلامی ساہتیہ پرکاشن دہلی نے چند ماہ قبل شائع کیا ہے۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۹۹ء کو اس کی تعارفی تقریب مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی جناب ایچ۔ ایس۔ پال ایڈوکیٹ سپریم کورٹ تھے۔ اس موقع پر مصنف نے کتاب کا تعارف تحریری شکل میں پیش کیا تھا۔ یہی تحریر ذیل میں دی جارہی ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور عقائد اور عبادات پر دیا ہے۔ عقیدہ اگر درست ہو اور عبادات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو تو فکر و عمل کا رخ بھی فطری طور پر صحیح ہو جاتا ہے اور زندگی صراط مستقیم پر گامزن ہونے لگتی ہے۔ عقائد و عبادات کے بعد اسلام نے اخلاق اور قانون کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس نے مکارمِ اخلاق کی ترغیب دی ہے۔ انسان کی عظمت و رفعت کے لیے کردار کی بلندی کو ضروری قرار دیا ہے، رذائلِ اخلاق کی قباحت واضح کی اور ان سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کی طرف اس نے بار بار توجہ دلائی ہے کہ انسان اخلاق کی پستی کے ساتھ خدا اور خلقِ خدا کا محبوب نہیں بن سکتا۔ اخلاق کی اہمیت اجاگر کرنے اور اس کی تشویق پیدا کرنے کے ساتھ اسلام نے زندگی کے لیے ایک جامع قانون اور نظام شریعت عطا کیا ہے۔

اخلاق اور قانون کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا کو جور و ظلم سے پاک ہونا چاہیے اور یہاں عدل و انصاف کا قیام عمل میں آنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ انسانوں کے اندر ایک دوسرے کی خدمت، تعاون اور ہمدردی کا جذبہ پایا جائے۔ قانون ظلم سے محفوظ رکھتا ہے اور خدمت کا جذبہ مخلوقِ خدا کی دست گیری اور غم گساری پر ابھارتا اور اسے سکون و راحت پہونچاتا ہے۔

اسلام نے شروع ہی سے ظلم و جور کے خلاف آواز اٹھائی۔ کم زور افراد اور طبقات کے حقوق واضح کیے اور معاشرہ کو ہدایت کی کہ وہ ان حقوق کو مجروح ہونے نہ دے اور

ان کو ہر حال میں ادا کرے۔ دوسری طرف خدمتِ خلق کا جذبہ ابھارا اور دوسروں کے دکھ درد اور مشکلات میں کام آنے کا حکم دیا۔

اس عاجز نے ان دونوں پہلوؤں کو اپنے علمی کام کا موضوع بنایا۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کم زوروں کے حقوق واضح کئے اور اسلام نے ظلم کے خلاف جو رویہ اختیار کیا ہے اور جس طرح کا نظام عدل وانصاف وہ قائم کرنا چاہتا ہے اسے اپنے مقالات میں تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام تشنہ ہے اس لیے ابھی کتابی شکل اس نے اختیار نہیں کی ہے۔

خدمتِ خلق بھی اس خاکسار کے مطالعہ کا موضوع رہا ہے۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح وبہبود کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو کرسچین مشنریز (Chris-tian missionaries) کا تصور ذہنوں میں ابھر آتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے نوعِ انسانی کی خدمت کا اس سے اعلیٰ وارفع تصور دیا ہے۔ فرد، معاشرہ اور ریاست سب کو اس میں شریک کیا ہے۔ اس نے جس تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے اور جن جن پہلوؤں کو ابھارا ہے اس کی نظیر شاید کہیں نہیں مل سکتی۔

خدمتِ خلق کے موضوع پر اس عاجز کا ایک رسالہ "انسانوں کی خدمت اسلام کی نظر میں" کے عنوان سے ۲۲ سال قبل ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اس اہم موضوع پر ہماری زبان میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے تو میں نے اس کا تفصیل سے مطالعہ کیا اور "اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور" کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب مرتب کی یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی علی گڑھ نے شائع کی۔ ۱۹۹۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن سامنے آیا۔ میں نے اس کتاب میں موضوع کے جامع مطالعہ (Comp rehensive study) کی کوشش کی ہے۔

پیشِ نظر کتاب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جن پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :-

۱۔ خدمت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ ایک معصوم بچہ کی خدمت، والدین اور خویش واقارب اسی جذبے کے تحت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اس فطری

جذبے کو تقویت پہنچاتا ہے۔

۲۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں نے خدمتِ خلق کی تعلیم دی ہے۔ سب سے آخر میں قرآن مجید اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف بطورِ خاص توجہ دلائی، اس کی سخت تاکید کی، ہمدردی کے جذبات ابھارے اور اسے خدا کی رضا اور خوشنودی کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا۔

۳۔ اسلام کے نزدیک خدمتِ خلق عبادت ہے۔ قرآنِ مجید، نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے۔ نماز میں خدا سے راست تعلق قائم ہوتا ہے اور زکوٰۃ بندگانِ خدا کی خدمت کی ایک صورت ہے۔ اس طرح اس نے دونوں کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض مواقع پر مالی عبادت کو بدنی عبادت کا بدل قرار دیا گیا ہے۔ بعض حالات میں روزہ کا بدل صدقات ہوجاتے ہیں۔ انفاق اور صدقات کا براہِ راست فائدہ انسانوں کو پہنچتا ہے۔

۴۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف اس امت ہی کی خدمت کا حکم نہیں دیا ہے جس سے ان کا دینی تعلق ہے بلکہ اس کے ساتھ عام انسانوں کی خدمت کی بھی تاکید کی ہے۔

۵۔ خدمت کی ہدایت کے ساتھ اسلام نے اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے! وہ کون سے افراد اور طبقات ہیں جو ہماری ہمدردی اور اعانت کے مستحق ہیں؟ اس میں ماں باپ اور رشتہ دار بھی ہیں جن سے ہمارا خونی رشتہ قائم ہے اور ایسے یتیم، مسکین، ہم سایہ، مسافر، غلام اور محکوم بھی آجاتے ہیں جن سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

۶۔ انسان کی بہت سی ضروریات روپے پیسے اور مال کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں اس لیے مال کے ذریعے خدمت کی خاص اہمیت ہے، لیکن خدمت کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے۔ حدیث کی رو سے کسی کا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا، کوئی میٹھا بول بولنا، سواری پر بیٹھنے میں مدد دینا، کسی کا سامان اٹھا کر اسے دے دینا، راستے سے کانٹے، پتھر یا کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا، کسی کو راستہ دکھانا، کسی کے برتن میں پانی بھر دینا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا یہ سب صدقات کی مختلف شکلیں ہیں اور صدقات سے خدمتِ خلق کی راہ نکلتی ہے۔ اصولی بات یہ بتائی گئی ہے "کل معروف صدقۃ" (ہر بھلا کام

کام صدقہ ہے)

۷۔ خدمت وقتی اور ہنگامی بھی ہوتی ہے۔ جیسے بھوکوں کو کھانا کھلا دینا، پیاسے کی پیاس بجھا دینا، یا کھانے کی تیاری کے لیے غلّہ، اناج، نمک، ایندھن، برتن جیسی کوئی چیز فراہم کر دینا، ننگے کو کپڑے مہیا کر دینا، مریض کی تیمار داری کرنا اور دوا علاج میں حسب استطاعت تعاون کر دینا۔ وغیرہ۔ بعض اوقات اس وقتی مدد کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسلام نے اس کی طرف خاص توجہ دلائی ہے اور اس میں ہر ایک کو اپنا حصّہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۸۔ اس کے ساتھ اسلام نے نوعِ انسانی کی مشکلات کے پائیدار حل پر زور دیا ہے۔ کسی مسکین اور بیوہ کی وقتی خدمت بھی باعث ثواب ہے۔ لیکن اس کے احتیاج اور پریشانی کو مستقل طور پر رفع کرنے کی کوشش شب و روز کی عبادت کے برابر ہے۔ اسی طرح کسی یتیم کے سر پر محبت اور پیار سے ہاتھ پھیرنا بڑی نیکی ہے۔ اس سے رقتِ قلب اور گداز پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی معاشی کفالت، تعلیمی اور اخلاقی نگرانی جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اس بات کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ جو لوگ نادار اور محتاج ہیں انھیں کاروبار سے لگایا جائے یا صنعت و حرفت میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

۹۔ خدمت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں۔ مالی تعاون کرنا، قرض دینا، قرض کی واپسی میں حسبِ حال مہلت دینا، ہبہ کرنا، ہبہ نہ ہو سکے تو کوئی چیز عاریۃً استعمال کے لیے دینا، ضرورت پر ایک جیسی دو چیزیں دینا، جیسے کاشت کے لیے دو بیل، دودھ کے لیے دو گائے یا بھینس، کسی سے اجرت پر کام لینے کی جگہ کاروبار میں اسے شریک کرنا، بٹائی پر کھیتی باڑی میں حصّے دار بنانا، مظلوم کی قانونی، اخلاقی اور معاشی مدد کرنا۔ یہ بعض وہ پہلو ہیں جن کی متعین طور پر احادیث میں نشاندہی کی گئی ہے ان پر دوسرے پہلوؤں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ رفاہی خدمات سے وسیع دائرے میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ خدمات افراد، ادارے اور حکومت بھی انجام دیتے ہیں۔ جیسے پاکی صفائی کا اہتمام، راستوں کو آسانی سے آمد و رفت کے قابل اور محفوظ و مامون بنانا، پانی کا نظم کرنا، شجر کاری اور پیڑ پودے

لگانا۔ اسی میں جنگلات کی حفاظت بھی آتی ہے۔ زمین کو استعمال کے قابل بنانا، مساجد ومدارس کی تعمیر اور شفاخانوں کا قیام وغیرہ۔ اسلام نے یہ اور اس نوعیت کے رفاہی کاموں کی طرف صرف توجہ ہی نہیں دلائی ہے بلکہ ان کے لیے اپنی جائداد یا ذرائع آمدنی کو وقف کرنے کی بھی ترغیب دی ہے اور اس کے قاعدے ضابطے وضع کیے ہیں۔

اسلام اس بات کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ خدمتِ خلق کے ادارے اور سوسائٹیاں قائم ہوں اور اس کے لیے تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اس سلسلہ میں وہ غیر مسلموں سے بھی تعاون کو جائز قرار دیتا ہے۔

اسلام کا ایک خاص Contribution یہ بھی ہے کہ اس نے خدمتِ خلق کے بارے میں پائے جانے والے غلط تصورات اور غلط رویّوں کی اصلاح کی۔ اس نے کہا کہ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں اس میں ایک فطری ترتیب ہے۔ اس ترتیب کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ماں باپ، بیوی بچوں اور رشتہ داروں کا حق دوسروں پر مقدم ہے۔ یہ صحیح نہ ہوگا کہ آدمی خدمتِ خلق کے جوش میں اجانب اور دور کے لوگوں کے حقوق پر توجہ کرنے لگے اور قریب ترین افراد کے حقوق کو فراموش کر بیٹھے۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہ ہوگی کہ آدمی قریب کے افراد کی محبت میں سماج کے دوسرے مستحقین کو نظر انداز کر دے۔

بعض مذاہب نے سماجی زندگی میں ایسا رویّہ اختیار کیا ہے کہ امیر وغریب کی مستقل تقسیم وجود میں آگئی ہے۔ بعض مذہبی گروہوں نے سوال اور گداگری کو پیشہ بنا رکھا ہے۔ اسلام اس رویّہ کے خلاف ہے۔ وہ امیر وغریب کی مستقل تقسیم کو ناروا سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سراسر ظلم ہے کہ ایک طبقہ مستقل طور پر احتیاج کی زندگی گزارے، سائل اور گداگر بن کر رہے اور دوسرا طبقہ احسان کرنے والا ہو۔ آدمی بعض مخصوص حالات میں تعاون کی درخواست بھی کر سکتا ہے۔ مگر ان حالات سے جلد نکلنے کی اسے لازماً کوشش کرنی چاہیے۔

بعض مذاہب میں خدمتِ خلق کو کل دین یا حاصلِ دین سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدمت ہی ان کا دین ومذہب تھا۔ یہ بھی قابلِ اصلاح رویّہ ہے۔ خدمتِ خلق کی تمام تر اہمیت کے باوجود اسلام اسے کل دین نہیں بلکہ جزو دین

سمجھتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک وہی عمل قابلِ قبول ہے جو اخلاص وللّٰہیت پر مبنی ہو۔ جس کام کے پیچھے نام و نمود کا جذبہ اور ریا کاری ہو وہ اس کے دربار سے رد ہو جاتا ہے بلکہ اس کے نزدیک موجبِ عتاب ہے۔ خدمتِ خلق جتنا اہم کام ہے اتنا ہی وہ اخلاص وللّٰہیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں اخلاص کا باقی رکھنا مشکل بھی ہے۔ لیکن اس کے بغیر اجر و ثواب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ کوشش اس بات کی رہی ہے کہ موضوع سے متعلق آیات و احادیث کا بڑی حد تک احاطہ ہو جائے اور موقع و محل کی مناسبت سے ان کا صحیح مفہوم واضح ہو جائے۔ اس ضمن میں خدمتِ خلق کے وہ پہلو بھی سامنے آجائیں جن کا موجودہ دور تقاضا کرتا ہے اس پوری بحث میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی فقہ، سیرت اور لغت سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس کتاب کو مقبولیت عطا کی۔ اس کا انگریزی ترجمہ The concept of social Service in Islam کے نام سے کئی سال قبل چھپ چکا ہے۔ تقریباً سال بھر پہلے اس کا تمل ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہے اور اس پر اللہ سبحانہٗ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تمل ترجمے کو دیکھ کر ایک غیر مسلم تمل اسکالر نے کہا کہ میں نے اسلامیات پر کافی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن اسلام کی واضح تصویر اور انسانوں کے لیے اس کا باعثِ خیر و فلاح ہونا سب سے زیادہ اسی کتاب کے ذریعہ واضح ہوا ہے اور اب اسلامی ساہتیہ ٹرسٹ دہلی نے "جن سیوا اور اسلام" کے نام سے اس کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اسے میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔